سروِ چراغاں
جالی
جمیل ملک

سرو چراغاں

سرودِ چراغاں

جمیل ملک

گوشۂ ادب چوک انارکلی۔ لاہور

مرحومہ بہن بتول کے نام

جس نے میرے اشعار سن کر بے ساختہ کہا تھا

"امی ! ہمارا جمیل تو شاعر نکلا"

○

ہم کو دیکھو ہماری صورت سے
منزلوں کا سُراغ مِلتا ہے

○

مُصنّف : جمیل ملک

ولادت : راولپنڈی ، ۱۲ اگست سنہ ۱۹۲۸ء

تعلیم : گارڈن کالج راولپنڈی سے ایم اے (اردو)

قیام : این ۲۲۲ ، پراچہ سٹریٹ راولپنڈی

دیگر تصانیف : ۱۔ طلوعِ فردا (نظم)
(زیرِ طبع)
۲۔ نظمیں اور غزلیں
۳۔ تنقیدی مضامین
۴۔ پنجابی گیت
۵۔ خطوط

دیباچے رسمًا کتابیں مرتب ہو جانے کے بعد لکھے جاتے ہیں مگر بعض دیباچے
ایسے بھی ہوتے ہیں جو کتابوں سے پہلے ہی صورت پذیر ہو جاتے ہیں۔ "سروچراغاں" کا
دیباچہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ اس وقت لکھا جا چکا تھا جبکہ یہ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد
بھی نہ تھا ! اس دیباچے کی کہانی یوں ہے :-

۱۹۵۵ء میں جولائی کا یا اگست کا مہینہ
تھا کہ "نقوش" میں جمیل کی ایک غزل میری نظر سے گزری جس کے دو شعر مجھے نادر سے
معلوم ہوئے۔ ان شعروں کا مضمون کچھ انوکھا سا تھا۔ مجھے ان میں سوچ کی صورتیں رسمی
تصورات سے خاصی ہٹی ہوئی یا بہ مختلف سی نظر آئیں وہ شعر یہ تھے :

دل کی قیمت، تو محبت کے سوا کچھ بھی نہ تھی
جو ملے صورتِ زیبا کے خریدار ملے

ہم نے کانٹوں کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے
خار بھی ہم سے برنگِ گل و گلزار ملے

مجھے جس چیز نے ان اشعار کی طرف خاص طور سے متوجہ کیا وہ بھی حسن کے مقابلے

ہیں محبت کی اہمیت! ان اشعار میں دردمندی اور ہمدردی کا بھی ایک خاص تصوّر نظر آیا۔ پھر یہ ہمدردی بھی ایک خاص نوعیت کی تھی۔ یعنی اس مخلوق کے ساتھ جسے دُنیا بدصورت یا کم صورت کے نام سے یاد کرتی ہے، عموماً نظر کے بازار میں (جسے لوگ کم فہمی سے محبّت کا بازار کہہ دیتے ہیں) اس جنس کو متاعِ کاسد سمجھ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے ــــ مگر سچے انسانی جذبوں کی نظر میں یہ مخلوق بھی ٹھکرائے جانے کے قابل نہیں، آخر اس کے پہلو میں بھی دل ہے اور دل، خواہ وُہ کسی کا دل ہو ـــ محبت کا طلب گار بھی ہے اور مستحق بھی! محبت تو دل کا دل سے معاملہ ہے۔ صرف دل و نظر کا نہیں اور ذوقِ نظر تو اس محفل کا محض تماشائی ہے ـــ اس سے زیادہ کچھ نہیں ـــ اصل شے جذبۂ محبت ہے نہ کہ حُسنِ نظر!

جمیل کے ان خیالات میں مجھے جستجو کا نیا انداز نظر آیا اور انسانی درد کی ٹیس بھی محسوس ہوئی۔ میں نے جمیل کو اپنے ان تاثرات سے اسی وقت باخبر کر دیا ـــ اور اس طرح اس دیباچے کے ابتدائی نقوش آج سے دو سال پہلے ہی تیّار ہو گئے جن کی رسمی تکمیل آج ہو رہی ہے اور اگرچہ میں طبعًا دیباچہ نگاری کا ذوق نہیں رکھتا اور اس مرتبہ بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کُوچے میں قدم نہ رکھوں مگر مجھے جمیل کی خاطرداری سے زیادہ اس احساس نے مجبور کر دیا کہ جب مَیں اس نوجوان ہونہار شاعر کی شاعری میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتا رہا ہُوں تو پھر مَیں اس کی شاعری کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کیوں نہ کر دوں! لہٰذا یہ دیباچہ!

اب سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ جمیل ملک کے فن یا آواز میں کوئی ایسی خصوصیت بھی ہے جسے ہم اس کی خاص یا نئی چیز کہہ سکیں؟ یہ سوال نہایت پیچیدہ، مشکل اور ذہانت آزما ہے۔ ہمیں اپنے دَور سے بہت سی شکایتیں ہیں، فکری بھی اور رُوحانی بھی، مگر یہ یقین ہے (کم از کم میرا یہ یقین ہے) کہ ہمارا یہ دَور ذہنی بانجھ پن کا دَور

نہیں ــــ میں اس کو ایسا نہیں سمجھتا، اس میں تخلیق کی کمی نہیں، تجربات کی کمی نہیں کاوش کی کمی نہیں ــــ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر مہینے نہ سہی، دُوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی دیوان غزل یا کوئی نہ کوئی مجموعۂ نظم ہمارے سامنے آہی جاتا ہے ــــ ان میں ہر درجے اور ہر قیمت کی کتابیں ہوتی ہیں اور ان میں سے بعض تو واقعی اچھی ہوتی ہیں، ظاہر ہے کہ ادبی سرمایہ جتنا زیادہ ہوگا، اتنی ہی تنقید کی ذمّہ داریاں بھی زیادہ ہوں گی ــــ نقّاد لاکھ ظالم، بے رحم، چیرہ دست یا غبی یا کُند ذہن کیوں نہ ہو، آخر یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ قارئین کے اس پر حقوق ہیں۔ انھیں (اور کچھ نہیں تو کافی حد تک ہی سہی) کچھ رہنمائی تو کرنی ہی چاہئے۔ غرض معنوی قدرشناسی کے معیار قائم کئے بغیر، نہ تو کوئی تنقیدی خدمت انجام دی جاسکتی ہے، نہ کسی نئی تخلیقی تحریک کے لئے صحیح رہنمائی کا کوئی اشاریہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ تنقیدی رپورٹ میں (خواہ وُہ کسی نوعیت کی ہو) ان عام اور مُشترک خصُوصیتوں سے جو کسی دَور کی عام خصُوصیات بن چکی ہیں، قطع نظر کرکے صرف وہی باتیں لکھی جائیں جو ایک شاعر اور دُوسرے شاعروں کے درمیان مابہ الامتیاز ہیں۔ اس سے اس شاعر کی خدمت بھی اچھی سرانجام ہوگی اور شاعری کی بھی۔

جمیلؔ ملک نوجوان شعرا کے اس گروہ سے تعلق رکھتا ہے جس کے نزدیک زندگی ایک حقیقت ہی نہیں ایک حسین حقیقت بھی ہے، اس لئے لازمًا اس کی شاعری کا مرکزی مضمون زندگی ہی ہے ــــ مگر خود زندگی کیا ہے؟ اس کی تعبیر جمیلؔ کے ہاں بھی وہی ہے جو جدید شاعروں کے باشعور گروہ کے نزدیک عام طور سے تسلیم شدہ ہے ــــ یعنی مسلسل عمل اور متواتر جدوجہد ــــ جمیلؔ کی غزلیات کا اہم ترین موضوع یہی ہے۔

بااین ہمہ جمیلؔ زندگی کی حدود کے بارے میں مطمئن نہیں، اُس کی نظر زندگی

کی نامعلوم وسعتوں پر چھا جانا چاہتی ہے۔ یہ وسعت اور کشادگی کی آرزو اس کے
احساس کی تہ میں اس شدّت سے موجزن ہے کہ یہی آرزو، اس کی ساری شاعری
میں رواں دواں معلوم ہوتی ہے ؎

دل چاہتا ہے ایک زمانے کی وسعتیں
ہم مطمئن نہیں ہیں تمہاری نگاہ سے

جمیلؔ جس طرح زندگی کے ثبات و صداقت پر یقین رکھتا ہے اسی طرح وُہ
عظمتِ انسان کا سختی کے ساتھ قائل ہے اور قائل ہی نہیں اس پر ایمانِ کامل رکھتا ہے
اور اس کیلئے ایسے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے جو کسی دُوسری مخلوق کے مقدّر میں نہیں
جمیلؔ کو انسان کی قدرت و قوت کا یہاں تک یقین ہے کہ اسے یہ بھی خیال ہے کہ
ایک روز انسان موت کو بھی مسخّر کرلے گا، ایک دن زندگی کے سینے کا یہ کانٹا بھی نکل ہی
جائے گا ؎

عظمتِ انساں کے آگے سجدہ ریز
یہ زمیں، یہ وسعتیں، یہ آسماں

مجھے جمیلؔ کی غزلوں میں جو خاص بات نظر آتی ہے، وُہ ہے فکر و تعقّل، جس کو
وُہ جذبہ کے رنگ سے رنگین کر دیتا ہے۔ جمیلؔ اصولاً فکر کا شاعر ہے، اس کا شعور موجودہ
دَور کے سماجی حقائق کی فضا کا تربیت یافتہ ہے۔ اس لئے اس کے یہاں مسلّم عقلی حقائق
ہی افکار و خیالات کی اساس اور ان کا محور و مرکز ہیں —— اس کی آواز میں اس اجتماعی آواز
کی گونج بھی سنائی دیتی ہے جو اس وقت کی دنیا کو انقلاب کے لئے آمادہ کر رہی —— افکار
کو غزل کے قالب میں ڈھال کر غزل کو کامیاب بھی بنا لینا آسان کام نہیں۔ مگر جمیلؔ کی
غزل علی العموم غزل کی حیثیت سے بھی، اپنی تاثیر کو فکر کی خشک متانت سے محفوظ رکھ کر
دل کش بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

جمیل کے خیالات میں ایک خاص قسم کی توانائی اس لئے بھی ہے کہ اُس کے یہاں (عام نئی شاعری کے برعکس) شکست و قنوطیت بالکل نہیں ہے۔ اس کے یہاں غم بھی راحت ہے۔ اس کے لئے فراق بھی ایک حیات بخش شئے ہے — یہ اثباتی لہر زندگی اور جد و جہد میں اس کے ایقان کو خاص طور سے مستحکم بنا دیتی ہے۔

جمیل کی محبت کا رنگ بھی انوکھا ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کی غیوری اور انانیت ہے — اول تو اُس کے نزدیک محبت زندگی سے ماورا کوئی چیز نہیں یہ زندگی ہی کا ایک شعبہ ہے۔ پھر محبت اس کے نزدیک حُسنِ عمل ہے، محض نظر اور ذوقِ نظر نہیں — حُسن، محبت کا موضوع ہے ضرور، مگر وُہ ایک موضوعی شئے ہے کیوں کہ حُسن در اصل انسان کے اپنے ہی جذبے کا انعکاس ہے، محبت اور حُسن دونوں ہی انسان کے شوقِ خود پرستی کے اشراقات ہیں — جمیل نے حُسن و محبت کے اس داخلی سلسلے کو منطقی نتائج تک پہونچانے کے بعد ایک اور زاویے سے بھی سوچا ہے — ایک خاص مقام پر پہونچ کر وُہ یہ بھی کہنے لگتا ہے کہ زندگی کے مقابلے میں حُسن و محبت دونوں کے دائرے محدود ہیں اور انسان کو اس کی آخری منزل (کمال) تک پہونچانے کا یقینی وسیلہ نہیں۔ اس کے نزدیک سوز زندگی ہی حُسن ہے اور یہی چیز محبت بھی ہے جس کا وجود ارتقائے حیات کے لئے ضروری ہے۔

حُسن و محبت کے بارے میں جمیل کی سوچ کا یہ انداز ہے مگر کوئی اگر اس فکر کی کڑیاں جوڑ کر اس کا تجزیہ کرنے پر آ جائے تو اُسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جمیل کے فکر میں یہاں بہت سے خلاء واقع ہو گئے ہیں — غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا مقابلہ اب ہماری شاعری میں عام ہے اور یہ کہنے کی رسم بھی عام ہے کہ حدیثِ دہر، حدیثِ عاشقی سے زیادہ دل کش ہے — مگر میرا خیال ہے اب وقت آ گیا ہے کہ اس تخیل یا تفکر کے خلاف ردِ عمل ظہور میں آئے — جذبے اور میکانکی عقلیت کی لڑائی کافی ہو چکی ہے —

مندرجہ بالا اندازِ نظر دراصل ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیانی زمانے میں رواج پذیر ہوا تھا۔ جب عام طور سے فرد کے جذبات کو اجتماعی مقاصد پر قربان کر دینے کی دعوت عام تھی۔۔۔ اس زمانے میں محبت پر بھی قدغن لگا دی گئی تھی۔ ۔۔۔ مگر وقت وقت کی بات ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اجتماعیت کے گراں بار اطواق و سلاسل کی قید سے انسان پھر نکل آیا اور اب احساس نے پھر یہ سوچنا شروع کر دیا ہے کہ اجتماع اور اس کی خدمت بجا و درست، مگر فرد کے اپنے جذبے بھی تو برحق ہیں، اب انسان پھر یہ کہنے لگا ہے کہ میں انسان سے محبت کروں گا۔ انبوہ سے یا مشین سے محبت نہیں کروں گا!

مگر جمیل اس طرزِ فکر میں مجبور ہے ۔۔۔ اس دور کی ساری باشعور شاعری اسی نہج پر چل رہی ہے ۔۔۔! جمیل تنہا اس کا ذمہ دار نہیں۔ سب کے ساتھ ہے! اس کی خصوصیت البتہ یہ ہے کہ اس نے اس عام فکر کو زیادہ منظم بنا دیا ہے۔ اس کی غزلیات میں غم، محبت، آرزو، حسن، ان سب اصطلاحوں کا جداگانہ مفہوم ہے جو مذکورہ بالا فکر کی روشنی میں متعین ہوا ہے ۔۔۔ میرے خیال میں مفہوم کا یہ انقلاب بھی کوئی بری چیز نہیں۔ قابلِ قدر بات اس سلسلے میں اگر ہے تو یہ ہے کہ جمیل کی غزل میں فکر اور عملی فلسفے کی متانت کے باوجود غزل کی دل کشی (اکثر حالتوں میں) خراب نہیں ہوئی

فکر اور غزل کا پیوند کوئی آسان کام نہیں۔ اس معاملے میں جمیل کی بھی بڑی آزمائش ہوئی ہے، اس میں وہ کبھی کامیاب ہوا ہے اور کبھی ناکام! اس مجموعے کی غزلیات میں دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی جہاں فکر کے غلبے نے شعریت کو خراب کر دیا ہے اور وہ بھی جہاں شعریت اور فکر عنان در عنان چل رہے ہیں۔ مگر عام تاثر یہ ہے کہ افکار کے غلبے کے باوجود ان کی غزلیت کے رنگ عموماً دل آویز و دل کش ہیں۔ انھوں نے عملیت کے اجتماعی فلسفے کو غزل کی شخصی لَے کے ساتھ بڑی اچھی طرح ہم آہنگ کیا ہے یہ بہت مشکل کام تھا جس سے جمیل مجموعاً عہدہ برا ہوا ہے۔ البتہ اس کے فکر کو اس سے

شکایت ہوگی کہ بعض جگہ فکر کی تہ میں محض ادعا معلوم ہوتا ہے خلوص نہیں — فکر کی منطقی حد بہت وسیع ہوگئی ہے!

اس مجموعے کی بعض غزلیات میں کامیاب شعری تجربات بھی ملیں گے۔ مثلاً غزلِ ذیل کو دیکھئے: اس میں نیچر، ماحول، کائنات، شاعر کی داخلی آواز اور اس کی خارجی نظر سب کے محسوسات و تاثرات باہم اس طرح ترکیب پا گئے ہیں کہ اس سے خاصی اونچی شاعری کی سطح ابھر آئی ہے۔

یہ منظر یہ روپ انوکھے سب شہ کار ہمارے ہیں
ہم نے اپنے خونِ جگر سے کیا کیا نقش ابھارے ہیں!
صدیوں کے دل کی دھڑکن ہے ان کی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پہ ہنس مکھ، چنچل، جگ مگ، جگ مگ تارے ہیں
ایک ذرا سی بھول پہ ہم کو اتنا تو بدنام نہ کر
ہم نے اپنے گھاؤ چھپا کر تیرے کاج سنوارے ہیں
کچھ باتیں، کچھ راتیں، کچھ برساتیں اپنا سرمایہ
ماضی کے اندھیارے میں یہ جلتے دیپ ہمارے ہیں
ایک جہاں کی کھوج میں اپنے پیار کی نگری چھوڑ آئے
اور زمانہ یہ سمجھا ہم پیار کی بازی ہارے ہیں
سب سے ہنس کر ملنے والے، ہم کو کسی سے بیر نہیں
دنیا ہے محبوب ہمیں اور ہم دنیا کو پیارے ہیں

اس غزل میں تفکّر بھی ہے اور رومانی تحیّر بھی — اس تفکّر و تحیّر کے اجتماع سے ایک عمدہ شعری تخلیق وجود میں آگئی ہے۔ یوں بلند فکر اور اچھی غزلیت کے منفرد نمونے بھی اس مجموعے میں کم نہیں، جن میں سے چند منتخب اشعار یہ ہیں:-

یہ اور بات ہے تُو نے سُنا نہیں ورنہ
قدم قدم پہ تجھے زندگی پکار گئی

جس میں نہ ہو زندگی کا پرتو
کچھ اور ہے وُہ ادب نہیں ہے

شبِ سیاہ نے دی آمدِ سحر کی نوید
خزاں کے جَور سے اندازۂ بہار کیا

نرم و پُر کیف یہاں زیست کا انداز نہیں
عرصۂ دہر ہے یہ انجمنِ ناز نہیں

اور کیا چاہیے جمیلؔ اگر
آدمی آدمی کو پہچانے

اپنے دم سے ہے روشنی ورنہ
دونوں عالم دُھواں دُھواں ہوتے

ازل کی دُھند میں لپٹے ہُوئے تھے کون و مکاں
ہمیں نے حُسنِ دو عالم کو آشکار کیا

غمِ جہاں کو گلے سے لگا لیا آخر
کسی کی یاد کہاں تک جمیلؔ بہلاتی

درِ زنداں سے تا بہ حدِ چمن
زندگی آج بے خطر آئی

اِک روز وُہ خود ہی تھام کر دل
آ جائیں تو کچھ عجب نہیں ہے

ایک دُنیا نے آزمایا ہے
پھر بھی دل سب کے کام آیا ہے

مُسکرا تو بھی میرے دل کی کلی!
زندگی مُسکرانے والی ہے

عجیب چیز ہے افسانۂ محبّت بھی
جو انتہا کو سمجھ لیں تو ابتدا نہ مِلے

کوئی ہم سا ہمیں مِلا ہی نہیں
کوئی مِلتا تو یاد بھی کرتے

یوں اپنا سُراغ پا لیا ہے
ہر ذرّے کو دِل بنا لیا ہے
ہستی کو رفیقِ جاں سمجھ کر
ہر غم کو گلے لگا لیا ہے

کبھی حیات کا غم ناگوار ہی نہ ہُوا
میں شکوہ سنجِ غمِ روزگار ہی نہ ہُوا

موت کا ایک رنگ، ایک ہی رُوپ
زندگی کے ہزار ہا اسلوب

اُن کو یاد آئے گا اپنا بھی فسانہ کوئی
دیکھنے والے ہمیں غور سے جب دیکھیں گے

جمیل کی غزلیات کا یہ مجموعہ اس کی کئی برسوں کی کاوش کی نمائندگی کرتا ہے۔ مجموعہ کی پہلی غزل ۱۹۴۶ء میں اور آخری غزل ۱۹۶۲ء میں لکھی گئی —— اس سارے عرصے میں جمیل کا فن اور فکر ارتقا کی قدرتی منزلیں طے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دُوسری ہر منزل پہلی منزل کے مقابلے میں ترقی یافتہ معلوم ہوتی ہے اور ہر ہر مرحلے پہ خلوص محنت اور فن سے محبت کے آثار صاف صاف ظاہر ہو رہے ہیں —— ۱۹۵۱ء تک کی غزلوں میں وہ پختگی نہیں جو آخری برسوں کی غزل میں ہے شروع شروع میں خیالات و تجربات کے لئے مناسب الفاظ کی بھی اُسے تلاش رہتی ہے اور بعض اوقات مناسب لفظ اُس کو نہیں مل سکا —— بعض موقعوں پر افکار سیدھی سادی علمی زبان ہی میں ڈھل گئے ہیں، شعری سانچوں میں سما نہیں سکے —— کبھی کبھی فکر کے منطقی قضیے بھی مکمل نہیں ہو سکے —— مگر دو تین سال کی مشق نے اکثر خامیاں دور کر دی ہیں —— اور آخری دو تین برس کی غزل میں تو خاصا بانکپن، خاصی رعنائی آ گئی ہے —— اور اس کے ساتھ فکر عقلی سچائیوں کے معیار پر بھی بالکل صحیح و درست ہے —— اب جمیل اس سطح کے قریب آ پہنچا ہے جہاں اونچی شاعری اپنی تجلّیات بکھیرتی ہے۔

"سرو چراغاں" میں تفکر بھی ہے اور زندگی بھی۔ انسان دوستی بھی ہے اور دعوتِ انقلاب بھی —— ان سب موضوعوں کے اعتبار سے اُردو کی نئی

شاعری میں یہ بالکل نئی آواز نہ سہی ، نئی آواز کا ایک خاص انداز ضرور ہے —— اس میں اثبات ہے اور اعتقاد و اعتماد بھی ۔ یہ یاس اور منفی قوتوں کے خلاف بغاوت کی ایک ایسی دعوت ہے جو قنوط و اضمحلال سے کسی طرح مصالحت کے لئے آمادہ نہیں ہے —— اس کا لہجہ عاشقانہ ہے مگر یہ ایسی عاشقی ہے جس میں غیوری ، حوصلہ مندی ، کوہ کنی اور ستارہ شکنی کی آرزو بھی پائی جاتی ہے

مجھے جو دو باتیں جمیل میں بھلی معلوم ہوتی ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے ، کہ اس کا کلام تلخی اور تندی کی آمیزش سے پاک ہے ۔ اس میں غم دوراں کی تلخیاں بھی مسکراہٹوں میں بدل گئی ہیں ۔ غیظ و غضب کی کوئی صورت اس میں نظر نہیں آتی —— یہ چیز عقائد کی پختگی اور ایقان کی استواری سے پیدا ہوتی ہے —— دوسری چیز جس سے میں متاثر ہوا ہوں اس کے لہجے کا انکسار ہے جس سے اس کی دردمندی کا پتہ چلتا ہے ، اس کی شاعری کو ان دونوں خصائص نے اس کے ہم عصروں کی شاعری سے الگ سا کر دیا ہے —— یہ تو ثابت ہے کہ جمیل نیا شاعر ہے جو فکر و عمل دونوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا —— اس لئے اس کی شاعری کے معنوی وزن نے اس کے خارجی لباس میں بھی قدرے متانت کا رنگ پیدا کر دیا ہے مگر جمیل کا دل اس قفس رنگ و بو کے اندر بھی نغمہ گری کے انداز بھولا نہیں :

طائر خوش نوا قفس میں سہی
شعلۂ گل تو زیر دام نہیں (جمیلؔ)

تفکر کے قیدی جمیل کے یہ نقوشِ جمیل شعلۂ گل ہی تو ہیں !

سیّد عبداللہ
استاذ ادبیات اردو
پنجاب یونیورسٹی

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
۱۶ نومبر ۵۸ء

○

رات بھر غم زدوں کے داغ جلے
لوگ سمجھے کہ شب چراغ جلے

حُسن نے اک ذرا سی لَو دی تھی
ظُلمتوں میں کئی چراغ جلے

آگ بھڑکے شراب خانے میں
مے کی گرمی سے ہر ایاغ جلے

اب کے فصلِ بہار میں اے دوست!
شعلۂ گل سے کتنے باغ جلے

ساری دُنیا میں روشنی ہو جائے
آج یُوں ایک ایک داغ جلے

کم نہ ہوگا یہ جذبۂ تخلیق
دل دھڑکتا رہے، دماغ جلے

۱۹۵۲ء

○

اے دوست اکیلی راتوں میں یوں داغ ہمارے جلتے ہیں
اس رشک سے شمعِ بزم تو کیا افلاک پہ تارے جلتے ہیں

اے کاش کوئی آکر میرا اس وقت سہارا بن جاتا
احساس میں ٹیسیں اُٹھتی ہیں، پلکوں پہ تارے جلتے ہیں

آنکھوں میں بہاروں کے منظر، افکار میں رقصاں میخانے
یہ عشق کے رنگیں شعلے ہیں ہم ان کے سہارے جلتے ہیں

آؤ احساس پہ چھا جاؤ، پیاسا ہوں پیاس بجھا جاؤ
دل میں اک آگ بھڑکتی ہے ہونٹوں کے کنارے جلتے ہیں

اک تو ہی جمیل اس دنیا میں پروانۂ شمعِ حسن نہیں
یہ آگ کچھ اتنی پیاری ہے اس آگ میں سارے جلتے ہیں

۱۹۴۷ء

○

گھبرا رہا ہوں چاند ستارے کہاں گئے
ٹوٹے ہوئے دلوں کے سہارے کہاں گئے

اب دل کو چھیڑتا ہی نہیں وصل کا خیال
وہ تیرے نرم نرم اشارے کہاں گئے

دل جس سے مستنیر تھا وہ آگ بجھ گئی
سینہ دھواں دھواں ہے شرارے کہاں گئے

جن کی چمک سے سرو چراغاں تھی زندگی
وہ مطلعِ حیات کے تارے کہاں گئے

سہنے کو سہہ تو لیں گے ستم ہائے روزگار
لیکن وہ غمگسار ہمارے کہاں گئے؟

اِک کوششِ مدام سے قائم ہے یہ نظام
دُنیا کے کام ورنہ سنوارے کہاں گئے

گُم ہو گیا ہوں کون سے طوفان میں جمیلؔ
کشتی کدھر رواں ہے، کنارے کہاں گئے

۱۹۴۶ء

○

پھر مجھے منجدھار میں آیا کناروں کا خیال
سوچتا ہوں لے نہ ڈوبے ان سہاروں کا خیال

آج پھر تنہائیوں میں روح گھبرانے لگی
آج پھر تڑپا رہا ہے غم گساروں کا خیال

تیری فرقت تو خزاں سے کر رہی تھی ہمکنار
دیکھتے ہی تجھ کو جاگ اُٹھا بہاروں کا خیال

لے ہی جاتا ہے مجھے تیرے حریمِ ناز تک
جوئے باروں، مرغزاروں، چاند تاروں کا خیال

چین لینے ہی نہیں دیتا کسی پہلو جمیلؔ
زندگی کی اُلجھی اُلجھی رہگزاروں کا خیال

سنہ ۱۹۴۷ء

○

غم سہہ لیں آنسو نہ بہائیں
لیکن ہوش میں تو آ جائیں!

ہائے مرے جذباتِ فراواں
مچلیں، تڑپیں، راہ نہ پائیں

بھیگ چلی ہے رات اندھیاری
جانے اب وہ آئیں نہ آئیں!

کوئی ایسی آگ ہو جس میں
خود بھی جلیں اُن کو بھی جلائیں

پیار کی آگ سے آنکھیں روشن
ہاتھ لگائیں تو جل جائیں

پیار میں دل خوں بھی ہوتا ہے
اب یہ کس کس کو سمجھائیں

پھولوں کا رس چوس کے بھونرے
اُڑ جائیں تو ہاتھ نہ آئیں،

کھلتے ہیں یوں ہونٹ تمھارے
جیسے کلیاں کھِل کھِل جائیں

کتنا سبک ہے ان کا تصوّر
چلنے لگی ہیں ٹھنڈی ہوائیں

غمزۂ جاناں، عشوۂ دوراں
دیکھ چکے ہیں ساری ادائیں!

سنہ ۱۹۵۴ء

○

آنکھوں آنکھوں میں اُدھوری سی کوئی بات ہوئی
آج پھر ان سے سرِ راہ ملاقات ہوئی

ہم نے پایا ہے اسی طور حقیقت کا سُراغ
ہم تو خوش ہیں کہ محبّت میں ہمیں مات ہوئی

کتنے ارمان تھے جن کو نہ مِلا اذنِ کلام
ان سے جب پہلے پہل اپنی ملاقات ہوئی

پیار کے کھیل میں جاں سے بھی گئے آخر کار
ہم نے جو بات نہ چاہی تھی وہی بات ہوئی

ناگہاں شور اُٹھا تھم سی گئی وقت کی رُو
دیکھتے دیکھتے کیا صورتِ حالات ہوئی!

کون سی سوچ میں کھوئے ہوئے بیٹھے ہو جمیل
کیا کوئی چوٹ لگی کوئی نئی بات ہوئی؟

سنہ ۱۹۵۳ء

○

اُتر کے دل میں اِسے گدگدا رہا ہے کوئی
یہ کس ادا سے مجھے یاد آ رہا ہے کوئی!

مری حیات پہ کیوں چھا رہی ہے تاریکی؟
مجھے نگاہ سے شاید گرا رہا ہے کوئی

یہی ہے تیری خُدائی یہی ہے تیرا نظام
کہ گام گام پہ صدمے اٹھا رہا ہے کوئی!!

خبر بھی ہے کہ پسِ پردۂ جنوں برسوں
تمھیں سے چھُپ کے تمھیں دیکھتا رہا ہے کوئی؟

اُجاڑ کر مرے دل کی مسرّتوں کا چمن
جمیل دُور کھڑا مُسکرا رہا ہے کوئی

سنہ ۱۹۴۸ء

○

فسانۂ غمِ دوراں مجھے نہ تڑپائے
کچھ اور تیرے تصوّر سے جی بہل جائے

دل و دماغ میں رقصاں ہے نکہتوں کا ہجوم
یہ کون آیا تصور میں بال بکھرائے

ہزار بار گئے یوں نوازن کی محفل میں
ہر ایک بار مگر زخم کھا کے لوٹ آئے

یہ اور بات ہے تیری سمجھ میں آ نہ سکے
وگرنہ کس نے فسانے مرے نہ دہرائے!

جلا رہی ہے مجھے دھوپ تیری فرقت کی
کہاں ہیں وہ تری زلفوں کے ریشمی سائے!

نگاہِ شوق کا پھولوں سے بھر گیا دامن
بہار بن کے وہ یوں میرے سامنے آئے

حقیقتوں کے جہاں میں جمیل کوئی نہیں
تری حیات پہ جو خواب بن کے چھا جائے

۱۹۴۸ء

○

دعوتِ شوق نہ دے شوخ نگاہوں سے مجھے
کہ گزرنا ہے ابھی زیست کی راہوں سے مجھے

بعض اوقات میں یہ سوچ کے ہنس دیتا ہوں
کیا ملا درد میں ڈوبی ہوئی آہوں سے مجھے!

تیری نظروں کا میں احسان نہ بھولوں گا کبھی
تیری نظروں نے بچایا ہے گناہوں سے مجھے

کچھ وہ پیمانِ وفا توڑ کے نادم ہیں جمیل
کچھ حجاب آتا ہے خود اپنی نگاہوں سے مجھے

سنہ ۱۹۵۱ء

O

لب پہ آئے تھے کچھ فسانے سے
لوگ کہتے پھرے زمانے سے

اُن کی آنکھوں میں دیکھ آئے ہیں
کچھ اشارے سے کچھ فسانے سے

اپنا پل بھر کا ساتھ بہتر ہے
عمر بھر ان کے ناز اٹھانے سے

ہم نے چُن لی بہار کی تصویر
زندگی کے نگار خانے سے

زخم دل کے نہ چھپ سکیں گے جمیل
اِس تکلّف کے مُسکرانے سے

۱۹۵۲ء

○

سب کے دل کو ایک ہی دُکھڑا سب کو ایک ہی روگ
جانے کیوں چُپ چُپ رہتے ہیں اِس بستی کے لوگ!

تم کو مُبارک دیس کی سُندر گلیاں اور بازار
ہم لوگوں کے دُور ٹھکانے ہم پردیسی لوگ

پیار کی آگ میں جل جل جائیں چندا اور چکور
جنم جنم کے روگ مٹیں گے جب ہو گا سنجوگ

جب بیماریٔ دل کے ہاتھوں سارے ہوں پامال
کون کرے پھر کس کا ماتم، کون منائے سوگ!

تُو نے کیا کیا ظلم کیے ہیں کیا کیا بَیر کمائے!
دیکھ زمانے پھر بھی اب تک زندہ ہیں ہم لوگ!!

۱۹۵۳ء

○

اَن گنت حسرتوں کا خوں بھی ہوا
بارہا زندگی میں یوں بھی ہوا

دل میں جب تھا تو پھول بن کے رہا
اشک آنکھوں میں آکے خوں بھی ہوا

انکھڑیوں نے شراب چھلکائی
مرمریں جسم لالہ گوں بھی ہوا

کشتِ اُمید لہلہا تو گئی!
لیکن اس میں جگر کا خوں بھی ہوا

سنہ ۱۹۵۳ء

○

رونا تھا مقدر میں ہنسی راس نہ آئی
ماحول کے ماروں کو خوشی راس نہ آئی

کہتے ہیں کہ دیوانگی ہے عشق کا حاصل
ہم کو تو یہ بے راہ روی راس نہ آئی

کیا زندگی ان کی ہے جنھیں تیرے جہاں میں
دو روز کی فرصت بھی کبھی راس نہ آئی

واعظ کو تو مے سے نہ غرض تھی نہ غرض ہے
رندوں کو مگر تشنہ لبی راس نہ آئی

مل کر بھی جمیل ان سے میں یہ سوچ رہا ہوں
کیا ہوگا اگر یہ بھی خوشی راس نہ آئی؟

سنہ ۱۹۴۰ء

○

پیہم نوازشات سے گھبرا گیا ہوں میں
اب تیرے التفات سے گھبرا گیا ہوں میں

کوئی بتاؤ ہے کوئی صورت، قرار کی؟
اس دل کی واردات سے گھبرا گیا ہوں میں

دُنیا میں پُر خلوص محبت بھی ہے کہیں
جھوٹے تعلقات سے گھبرا گیا ہوں میں

یہ رات ہی تو ضامنِ صبحِ بہار ہے
کس نے کہا کہ رات سے گھبرا گیا ہوں میں؟

اِک انقلاب آئے تو شاید سکوں ملے
ٹھہری ہوئی حیات سے گھبرا گیا ہوں میں

سنہ ۱۹۴۷ء

○

ان کے معصوم اشاروں نے بلایا ہے مجھے
آج پھر میرے سہاروں نے بلایا ہے مجھے

چند لمحوں کے لیئے اور ترے پاس ہوں میں
اجنبی راہگزاروں نے بلایا ہے مجھے!

کیا میں منہ موڑ لوں بپھرے ہوئے طوفانوں سے؟
یہ سمجھ کر کہ کناروں نے بلایا ہے مجھے!

میں، کہ اپنے بھی کسی کام نہیں آ سکتا!
حسرت و یاس کے ماروں نے بلایا ہے مجھے!

اب کوئی دم میں ہوئی جاتی ہے گل شمعِ حیات
ڈوبتے چاند ستاروں نے بلایا ہے مجھے

میں نے برسوں میں جنھیں دل سے بھلایا تھا جمیل
پھر انھیں راہگزاروں نے بلایا ہے مجھے!

۱۹۴۸ء

O

دل و نگاہ کے پیاروں کو چھوڑ آئے ہیں
ہم آج اپنے سہاروں کو چھوڑ آئے ہیں

تجھے خیال بھی ہے ان خزاں نصیبوں کو؟
ترے لئے جو بہاروں کو چھوڑ آئے ہیں

گزر رہے ہیں مسافر مہیب راہوں سے!
حسین راہگزاروں کو چھوڑ آئے ہیں!!

پلٹ کے جانا بھی چاہیں تو جا نہیں سکتے
سفینے اب تو کناروں کو چھوڑ آئے ہیں

سنہ ۱۹۴۸ء

○

ایک عالم کو یاد کرتے ہیں
جب ترے غم کو یاد کرتے ہیں

ہم کو تیری طلب ہے یُوں جیسے
پھُول شبنم کو یاد کرتے ہیں

پیار کے رُوپ میں جو ہم کو ملا
اس حسیں غم کو یاد کرتے ہیں

دیکھ کر انتشار دُنیا کا
حُسنِ برہم کو یاد کرتے ہیں

خود کو پہچانتے نہیں جو لوگ
ابنِ مریم کو یاد کرتے ہیں

وہ ہمارے نہ ہو سکے لیکن
آج بھی ہم کو یاد کرتے ہیں

۱۹۵۱ء

○

آپ نے دل میں ہی چھپا لی ہے؟
ہم نے نظروں سے بات پا لی ہے

اِس طرف بُوند بھی نہیں آئی
کس طرف تم نے مے اُچھالی ہے!

کیا کوئی ہے جواب ان کے لیئے؟
جن کی اک اک نظر سوالی ہے

نگہِ دوست! کیا کیا تُو نے!
غیرتِ عشق بیچ ڈالی ہے!

مُسکرا تُو بھی میرے دل کی کلی
زندگی مُسکرانے والی ہے

کیا کریں حُسنِ دوست کی باتیں
دل پریشاں ہے ذہن خالی ہے

آج تو راز کھل چلا تھا جمیلؔ
کس ادا سے نظر بچا لی ہے

۱۹۵۱ء

○

جس میں تم سا حسین پھول نہیں
ہم کو ایسا چمن قبول نہیں

حسن سے دل کے داغ دھو لینا
اِک تقاضا ہے، کوئی بھول نہیں

غم سے آنکھیں ملا بھی سکتی ہے
زندگی اس قدر ملول نہیں!

سایۂ زلف ہی بہت ہے اُنھیں
جن کو دار و رسن قبول نہیں

ہم سے کیا کیا شکایتیں ہیں اُنھیں!
جن کا اپنا کوئی اُصول نہیں

سنہ ۱۹۵۳ء

○

بکھرے ہوئے دن رات کا شکوہ نہیں کرتے
مجبور ہیں، حالات کا شکوہ نہیں کرتے

گزرے گی جو دل پر اسے ہنس ہنس کے سہیں گے
لو تم سے کسی بات کا شکوہ نہیں کرتے

جن کو ہے یقیں آئے گی گلرنگ سحر بھی
وہ لوگ کٹھن رات کا شکوہ نہیں کرتے

دنیا سے انہیں لاکھ شکایت سہی لیکن
دیوانے، تری بات کا شکوہ نہیں کرتے

مجرم ہیں تو اب وقت ہی انصاف کرے گا
ہم تیری عنایات کا شکوہ نہیں کرتے

ہارے ہیں جمیل آج تو کل جیت بھی ہو گی
مسرور ہیں ہم مات کا شکوہ نہیں کرتے

۱۹۵۱ء

O

پھولوں میں کہاں یہ دلکشی ہے!
اُف کتنی جواں تری ہنسی ہے!

جیتے ہیں مگر بحالتِ غیر
کیا خوب ہماری زندگی ہے!

اب تک ہیں نشیبِ تیرہ و تار
ہر چند اُفق پہ روشنی ہے

تخلیقِ حیاتِ نو کی خاطر
کس شوق سے ہم نے جان دی ہے!

غم جس میں نہیں جمیل کوئی
اِک وہ بھی نظامِ زندگی ہے!

سنہ ۱۹۵۱ء

○

پلکوں پر کچھ دیپ جلے
آج وہ ہم سے رُوٹھ چلے

پہلے جب دل توڑ دیا
اب کوئی کیوں ہاتھ ملے

ذوقِ سفر ہی کام آیا
ہم گِر گِر کر بھی سنبھلے

کُندن بن کر چمکے گا
دل سے کہدو خُوب جلے

طوفانوں سے اُلجھیں گے
ساحل کون چلے

سنہ ۱۹۵۱ء

○

اُلجھے ہیں جب سے تیری مقدس نگاہ سے
آنے لگے ہیں ہم بھی نظر بے گناہ سے

گزرے ہیں اس طرف سے کئی رہروانِ شوق
دامن بچا بچا کے نہ چپسل گردِ راہ سے

اب تک تجھے خبر بھی نہیں ہے مگر یہاں
دُنیا بدل گئی ہے تری اک نگاہ سے

اُجڑا ہُوا نصیب، جہاں بھر کی ٹھوکریں
کیا کچھ نہیں ملا ہمیں عالم پناہ سے

دل چاہتا ہے ایک زمانے کی وسعتیں
ہم مطمئن نہیں ہیں تمھاری نگاہ سے

وہ لوگ ہی جمیل سنواریں گے یہ جہاں
جو آج پھر رہے ہیں لٹے سے تباہ سے

سنہ ۱۹۵۱ء

○

نگری نگری محفل محفل افسانے مشہور ہوئے
شمع محبت جلی ہزاروں پروانے مشہور ہوئے

ہم نے اتنی دیر چھپایا دل میں راز محبت کا
دنیا کی نظروں میں پیار سے بیگانے مشہور ہوئے

دل کی دشمن آنکھوں نے ہر بات زمانے سے کہہ دی
تیری کافری چاہت کے تانے بانے مشہور ہوئے

آخر لوگ ہمیں باتوں ہی باتوں میں پہچان گئے
ہم بھی اپنے حسن بیاں سے فرزانے مشہور ہوئے

وحشت خانوں کی یادیں ہر دل سے اٹھتی جاتی ہیں
وقت کے تیور بدلے لاکھوں غم خانے مشہور ہوئے

تجھ کو کیا معلوم ہے شہرت سب کے بس کا روگ نہیں
جان کی بازی کھیل کے تیرے دیوانے مشہور ہوئے

ہر میخانے میں اس کی بادہ نوشی کے چرچے ہیں
ایک جمیل کے دم سے کتنے میخانے مشہور ہو گئے

۱۹۵۲ء

○

وہ سمجھتے ہیں ہمیں ان کی جفا یاد نہیں
یُوں ہی خاموش ہیں ورنہ ہمیں کیا یاد نہیں!

جانے کیا بیت رہی ہے ترے دیوانوں پر
اِن دنوں ان کو تری کوئی ادا یاد نہیں

ہم نے جاں دے کے خُدائی کا بھرم رکھا ہے
پھر بھی شکوہ ہے انھیں ہم کو خُدا یاد نہیں

وہ مرا پیار تو کیا یاد تجھے آئے گا!
تجھ کو اپنی بھی کوئی خاص ادا یاد نہیں!!

اس طرح ڈوب گیا ہوں تری رعنائی میں
جیسے کچھ بھی تو مجھے تیرے سوا یاد نہیں

ان سے تو زیست بھی کترا کے نکل جاتی ہے
جن کو اس دور میں جینے کی ادا یاد نہیں

ایک ہم ہیں کہ ہوئے مُفت میں بدنام جمیلؔ
ایک وہ ہیں کہ انھیں اپنی خطا یاد نہیں

۱۹۵۲ء

○

آج کچھ درد سوا ہے تجھے معلوم بھی ہے!

دل کسے ڈھونڈھ رہا ہے تجھے معلوم بھی ہے!

تیرا غم لے کے مری جان محبت میں مجھے

کتنا آرام ملا ہے تجھے معلوم بھی ہے

جان دینا کسی سلجھے ہوئے مقصد کے لیئے

کس قدر شوخ ادا ہے تجھے معلوم بھی ہے

آج زنداں سے نکل آئے ہیں سب دیوانے

ہر طرف جشن بپا ہے تجھے معلوم بھی ہے

یہ جو اک داغ سا ہے چاند کے سینے میں جمیل

کس کا نقشِ کفِ پا ہے تجھے معلوم بھی ہے

۱۹۵۲ء

○

جس سمت تری نظر گئی ہے
ہر دل میں اُتر اُتر گئی ہے

اس پھول سے دل پہ یاد تیری
شبنم کی طرح نکھر گئی ہے

تاروں سے بھی دُور بات اپنی
بے منتِ بال و پر گئی ہے

تاریکیاں سب سمٹ گئی ہیں
جس راہ سے بھی سحر گئی ہے

خوشبو سے مہک اُٹھا ہے گلشن
کہنے کو کلی بکھر گئی ہے

برہم تھی جمیل زلفِ گیتی
کون آیا کہ یہ سنور گئی ہے؟

۱۹۵۲ء

○

کون ہمارا درد بٹائے، کون ہمارا تھامے ہات
ان کے نگر میں جگمگ جگمگ اپنے دیس میں راتیں ہی رات

نیلے نیلے امبر پہ وہ چاند، وہ کرنوں کی برسات
ہم دونوں کھوئے کھوئے سے ہاتھ میں دست منوہر گات

تو گلشن گلشن اٹھلائے، میں صحرا صحرا بھٹکوں
دل کا یہ سودا ہے ورنہ تیرا اور میرا کیا سات

چاہے اب اس کو اپناؤ، چاہے ناز سے ٹھکراؤ
آج سے اپنا دخل نہیں ہے دل کی ڈور تمھارے ہات

دُنیا کا نشا ہے پیارے ہم گھٹ گھٹ کر مر جائیں
دل کی دھڑکن یہ کہتی ہے اک دن بدلیں گے حالات

سب دُنیا داری کی باتیں دل میں اور زباں پہ اور
تجھ سے پیار بڑھا کر آخر جان گئے تیری اوقات

میں نے ایک انوکھی لے سے سب کے دل پگھلائے ہیں
دنیا کو یہ دُکھ ہے کہ میرے ہونٹوں پر ہے اپنی بات

۱۹۵۲ء

○

پیاس ہے من کو ترسے درشن کی
جی جلاتی ہے ہوا ساون کی

یوں ہے سنسان نگریا من کی
جیسے تنہائی کسی جوگن کی

کس نے گھائل کی زباں سمجھی ہے!
کون فریاد سُنے برہن کی!

اب تو یوں تیرا خیال آتا ہے
بات جیسے ہو کوئی بچپن کی

جس میں کھیلی تھی جوانی اپنی
چھن گئی یاد بھی اس آنگن کی

دل کہیں، دھیان کہیں رہتا ہے
اب نہیں ہم کو خبر تن من کی

گرم سانسوں کی چتا جلتی ہے
پوچھتے کیا ہو مری تڑپن کی

دل نے سمجھا تری آواز آئی
جب ہوا کان میں آ کر سنکی!

کان بجتے ہیں کہ پائل تیری
دھیان سنتا ہے صدا چھن چھن کی

کیسے شرمائیں کنواری کلیاں
جب چلی بات ترے جوبن کی

اپنی آواز میں تھی آگ جمیل
ہم نے شعروں سے فضا روشن کی

۱۹۵۵ء

○

دل میں لے کر ترا ہی پیار آئے
کتنے منصور سُوئے دار آئے!

گھر سے آیا ہے یوں خیال ترا
جس طرح ابرِ نو بہار آئے

سب جہاں دل کا ساتھ چھوڑ گئے
تم وہاں یاد بار بار آئے

اور بھڑکے ذرا شباب کی آگ!
اور کچھ حسن پہ نکھار آئے!!

اور تجھ سا جہاں میں کوئی نہیں
تجھ کو شاید نہ اعتبار آئے

جب کبھی فرصت ملی زمانے سے
ہم تری کاکلیں سنوار آئے

ذہن بیدار تھا انقلاب خو تھا
ہم شبِ زندگی گزار آئے

۱۹۵۴ء

○

کیونکر ہو حسنِ شعبدہ گر اختیار میں
دل اختیار میں نہ نظر اختیار میں

سوئے حرم چلیں کہ چلیں سوئے میکدہ
ہے زندگی کی راہ گزر اختیار میں

ڈالیں گے مہر و ماہ پہ بھی ہم کمندِ شوق
برق و شرر ہیں آج اگر اختیار میں

سنتے نہ شامِ ہجر کے طعنے رقیب سے
ہوتی اگر نگارِ سحر اختیار میں

دونوں جہان پر ہے مری دسترس جمیلؔ
یہ شوخ دل نہیں ہے مگر اختیار میں

۱۹۵۲ء

○

اس طرح ماہِ نو اُبھرتا ہے
جیسے دل سے کوئی گزرتا ہے

کوئی تو بات ہے کہ ایک جہاں
اس ستم گر کو یاد کرتا ہے

جاگ اُٹھتے ہیں لاکھ ہنگامے
حُسن جس راہ سے گزرتا ہے

عقل کو اعتبارِ منزل ہے
دل سہارے تلاش کرتا ہے

یوں اندھیرے میں پھُوٹتی ہے کرن
جیسے دل ڈوب کر اُبھرتا ہے

اِک کلی کھل کے پھول بنتی ہے
جب بھی جھونکا کوئی گزرتا ہے

دیکھیں کن منزلوں سے اب کے جمیل
زیست کا کارواں گزرتا ہے!

۱۹۵۳ء

○

اک دردِ ازل سے کسے محبوب رہا ہے
جو نام ترے نام سے منسوب رہا ہے

کس شوق سے ملتے ہیں اندھیروں سے اجالے
آجاؤ مرے پاس کہ دن ڈوب رہا ہے

کیوں آج ٹھہرتی نہیں اس پر تری نظریں؟
کل تک تو یہی دل تجھے محبوب رہا ہے

کس درد کی غمّاز ہیں سنسان فضائیں
شاید کسی نادار کا دل ڈوب رہا ہے

گلشن کی المناک حکایات کے باوصف
یہ تذکرۂ دار و رسن خوب رہا ہے

۱۹۵۳ء

○

لذّتِ حسن کبھی ہم کو سوا ملتی ہے!
رس میں ڈوبی ہوئی ایک ایک ادا ملتی ہے

چُپکے چُپکے کئی ارماں سُلگ اُٹھتے ہیں
سوئی سوئی تری آنکھوں میں حیا ملتی ہے

وادیٔ شوق میں آ کر کوئی دیکھے تو سہی
نکہت و نُور سے لبریز فضا ملتی ہے

یونہی تھم تھم کے گزرتی ہے گلستاں سے نسیم
اسی ناداں سے تری لغزشِ پا ملتی ہے

رات کے پچھلے پہر یوں وہ چلے آتے ہیں
جیسے بھیگی ہوئی کلیوں سے صبا ملتی ہے

تجھ کو مجبور کہوں یا تجھے مجرم جانوں!
کتنی ارزاں ترے کوچے میں وفا ملتی ہے!!

جانے کیا بات ہے وہ شوخ، وہ لیلائے حیات
جب بھی ملتی ہے فقیروں سے خفا ملتی ہے!

ان کو معلوم ہی کیا گردشِ دوراں کا مزاج!
زندگی جن کو بصد ناز و ادا ملتی ہے

غمِ انساں کو بنایا تو ہے ایماں اپنا
دیکھیں اس جرم کی کیا ہم کو سزا ملتی ہے؟

زندگی کا تو بہانہ ہے وگرنہ اے دوست!
ہم وہاں ہیں کہ جہاں مفت قضا ملتی ہے

کچھ وہی صاحبِ فردا ہیں زمانے میں جمیل
جن کے سنولائے سے چہروں پہ ضیا ملتی ہے

سنہ ۱۹۵۳ء

○

روح پر کتنے زمانوں کا اثر دیکھا ہے
زیرِ افلاک تماشائے بشر دیکھا ہے

سُنتے آئے ہیں بہت جبر و جفا کے قصّے
تم سا بیدرد کہاں ہم نے مگر دیکھا ہے!

یہ بھی اک رسمِ محبت ہے، کوئی جرم نہیں
تم سے چھپ کر بھی تمھیں ہم نے اگر دیکھا ہے

جب بھی گزرا ہے کوئی شوخ مرے پہلو سے
تیرے دھوکے میں اسے بارِ دگر دیکھا ہے

انگلیاں کتنی اُٹھیں بات کہاں تک پہنچی!
تم کو بھولے سے اگر ایک نظر دیکھا ہے

جسم ناسور، زباں گنگ، تہی دستِ سوال
ایک شہکار سرِ راہگذر دیکھا ہے

میرؔ کے گھر سے بہت ملتی ہے وحشت اس کی
دوستو! تم نے کبھی اپنا نگر دیکھا ہے؟

کیوں نہ کہدیں کہ وہ گلرنگ سحر آئے گی
رات بھر چاند ستاروں کا سفر دیکھا ہے

دل تو دل ذہن بھی اس آگ میں جلتا ہے جمیلؔ
ایک شعلہ سا پسِ پردۂ در دیکھا ہے

سنہ ۱۹۵۳ء

○

دُور اُفق پر جو چمکتا ہے ستارا تو نہیں!
یا کوئی غمزۂ محبوبِ دلآرا تو نہیں!!

اسی اُمید پہ جیتے ہیں کہ مٹ جائیں گے غم
ورنہ یہ زیست کا زہرآب گوارا تو نہیں

ابھی پتوار سلامت ہیں، رواں ہے کشتی!
ابھی طوفاں ہے نگاہوں میں کنارا تو نہیں!

ہم کو ہر گام پہ درپیش تھے سو سو فتنے!
دل مگر محشرِ حالات میں ہارا تو نہیں!

اُس نے درپردہ کیا غیر سے دل کا سودا!
ہم جسے اپنا سمجھتے ہیں ہمارا تو نہیں!

کتنی صُبحوں کا اُجالا ہے ترا رُوئے جمیل!
تجھ سے بڑھ کر کوئی ہمدم کوئی پیارا تو نہیں!

۱۹۵۳ء

○

بطرزِ نو مرے پہلو سے درد اُٹھتا ہے
نہ جانے آج مجھے انتظار کس کا ہے؟

یہ اعتمادِ نظر ہے کہ انتہائے خلوص؟
تری نگاہ پہ اپنی نظر کا دھوکا ہے

بہارِ حسن! تری عصمتِ شباب کی خیر
اس احتیاط سے تجھ کو ہمیں نے دیکھا ہے

علاجِ تلخیِ غم پر اگر نگاہ رہے
ہجومِ یاس میں دل مسکرا بھی سکتا ہے

مزاجِ محفلِ رنداں سے بے خبر ہو گا
وہ بادہ کش جو بھری انجمن میں تنہا ہے

جو ایک بات چلی تھی ہماری محفل سے
اس ایک بات کا سارے جہاں میں چرچا ہے

سنہ ۱۹۵۴ء

○

تم سے بچھڑ کر بستی بستی، قریہ قریہ چھانا ہے
برسوں کے بعد آج ملے ہیں تم نے ہمیں پہچانا ہے؟

چلتے چلتے پھوٹ بہے ہیں اب تو پاؤں کے چھالے بھی
کتنے کوس ہے منزل اپنی کتنی دور ٹھکانا ہے؟

راہ بہت آسان تھی تم سے جب اپنی پہچان نہ تھی
منزل اب دشوار سہی پر ہم کو ساتھ نبھانا ہے

کون ہمارا محرم تھا جب تنہا تنہا رہتے تھے
گلشن گلشن چہکے ہیں تو سب نے ہمیں پہچانا ہے

تو ہی نگارِ صبحِ طرب ہے تو ہی بہارِ دیدہ و دل
سب کے دل ہیں یاد تری، ہر لب پہ ترا افسانا ہے

سنہ ۱۹۵۴ء

○

یہ بادلوں[۱] کی طرح مل کے یوں بچھڑ جانا
سمجھ میں آئے تو کیا آئے دل کا افسانہ

یہ سیلی سیلی فضائیں، یہ تیز تیز ہوا
یہ برف برف گھٹائیں، یہ آئینہ خانہ

ہوا میں اُڑتے ہیں جگنو کہ برف گرتی ہے!
ہنسی کا نُور ہے یا آنسوؤں کا نذرانہ!

یہ روشنی، یہ اندھیرا، یہ دُھوپ چھاؤں کا کھیل
کہیں ہے چاند نگر اور کہیں سیہ خانہ

تمھارا پیکرِ شب تاب ہے کہ برف کی ضَو!
چمکتی رات کو لَو دے کے اور چمکانا!!

۱؎ یہ غزل برف پوش مری کی آغوش میں کہی گئی۔

ہوا کے ساتھ بہیں، بادلوں کے ساتھ اُڑیں
تم اپنا دودھیا آنچل فضا میں لہرانا!

جمیلؔ روک لو بڑھ کر سحاب پاروں کو
کہ مختصر ہے بہت یہ وصالِ جانانہ!

۱۹۵۶ء

○

شب کے پُر ہول نشیبوں سے گزر آئی ہے
زندگی صورتِ خورشید اُبھر آئی ہے

پوچھتی ہے کہ اُفق پار سے تم نے جھانکا!
تم چلے آئے ہو یا بادِ سحر آئی ہے!!

حسن کے چہرۂ شب تاب پہ ہے عشق کی ضو
ایک مدت میں ہمیں اپنی خبر آئی ہے

میری آغوش میں تم ہو کہ ابابیل کوئی،
اُڑتے اُڑتے مری بستی میں اتر آئی ہے؟

دیکھئے کس پہ گرے کس کو جلا کر رکھ دے!
ایک بجلی سی رگ و پے میں اتر آئی ہے!

آج تدبیرِ بشر رقص کناں دیکھی ہے
سر برہنہ ہمیں تقدیر نظر آئی ہے

کیا ہوا ہم کو اگر ساغرِ زہر آب ملا
اس سے کردار کی عظمت تو نکھر آئی ہے

۱۹۵۴ء

○

خُون بن کر دلِ گیتی میں رواں رہتی ہے
خواہشِ زیست بہرحال جواں رہتی ہے

وہ ترے ایک تبسّم کے تمنّائی ہیں
جن کے سینے میں خلش، لب پہ فغاں رہتی ہے

لب پہ آتی ہے تو سنگیت میں ڈھل جاتی ہے
دل میں گو یاد تری نوحہ کناں رہتی ہے

میری منزل بھی نہیں تُو، مرا حاصل بھی نہیں
زیست پھر کیوں تری جانب نگراں رہتی ہے؟

لوگ بستے ہیں جہاں غم کے جہاں چرچے ہیں
نوعِ انساں کی مسرت بھی وہاں رہتی ہے

فکر آزاد ہے، نغموں سے فضا ہے آباد
گو مرے پاؤں میں زنجیر گراں رہتی ہے

ق

کوئی صیّاد اسے قید نہیں کر سکتا
زندگی رقص کناں، نغمہ فشاں رہتی ہے

سنہ ۱۹۵۴ء

○

ہم نے بھی اشک پی لئے ہوتے
تم اگر مسکرا دئیے ہوتے

دیکھتے ہم بھی رات کا انجام
صبح تو تک اگر جئے ہوتے

وادیاں، شہر، لہلہاتے چمن
کاش تیرے مرے لئے ہوتے

کون کہتا حکایتِ منصور!
ہم نے بھی لب اگر سئے ہوتے!!

۱۹۵۲ء

○

سامنے آکے تو پکار مجھے
اب نہیں تابِ انتظار مجھے

چارۂ حالِ زار بھی تو کریں
دیکھتے ہیں جو سوگوار مجھے

مجھ سے رونق ہے باغِ ہستی کی
شاخِ گُل سے نہ یوں اُتار مجھے

کر گئی ہم کنارِ منزل سے
شوخیٔ نقشِ پائے یار مجھے

آپ چھپ کر مری نگاہوں سے
کر گیا کون آشکار مجھے؟

موت بھی آکے لوٹ جائے گی
زندگی پر ہے اعتبار مجھے

سنہ ۱۹۵۴ء

○

ہم نہ دل کی زباں پہ لائے
آج کیا کیا انھیں خیال آئے

کس مسافر کے انتظار میں ہیں!
بام و در، جاگتے ہوئے سائے

یوں اندھیرے میں نور تیر گیا
جس طرح تیرا جسم لہرائے

معصیت کی مہیب راتوں میں
کتنے معصوم چاند گہنائے!

بادِ صرصر ذرا سنبھل کے گزر
گل رخوں پر نہ کوئی آنچ آئے

دل میں طوفاں چھپائے پھرتے ہیں
نخوتِ قیصری کے ٹھکرائے

۱۹۵۴ء

○

سرو و شمشاد و جوئبار کی بات
یارو! چھیڑو کوئی بہار کی بات!!

لمحے صدیوں پہ ہو گئے بھاری
پوچھتے کیا ہو انتظار کی بات

دام پھینکے گئے قرینے سے
جب چمن میں چلی بہار کی بات

شبنم و گل کی داستاں محدود
عام ہے شعلہ و شرار کی بات

زندگی سے حسین تر تو نہیں
سایۂ گل کہ زلفِ یار کی بات

خُون سے تر ہے آستیں ان کی
اور اپنے لبوں پہ پیار کی بات

آسماں بھی زمیں سے دُور نہیں
یہ بھی ہے اپنے اختیار کی بات

اُف وہ لفظوں کا نرم جال جمیلؔ!
ہائے وہ حُسنِ اعتبار کی بات!!

سنہ ۱۹۵۴ء

○

چاند تاروں کو نیند آتی ہے
آ بھی جاؤ کہ رات جاتی ہے

اِک تقاضا ہے ان کی آنکھوں میں
اِک طلب مجھ کو گدگداتی ہے

کِس پتنگے کی خاک ہے بیتاب
شمع رہ رہ کے جھلملاتی ہے

تجھ سے کوئی گِلہ نہیں پیارے
سادگی اپنی یاد آتی ہے

خود کو پہچان کر بڑھو آگے
زِندگی آئینہ دکھاتی ہے

۱۹۵۴ء

○

رُک سے گئے ہیں آنسو تھم سی گئی ہیں آہیں
کس جانِ سرخوشی سے جا کر ملیں نگاہیں!

اس دورِ پُرخطر میں یارو قدم قدم پر
احساسِ زندگی نے بخشیں ہمیں پناہیں،

خود کو بُھلا کے دل نے جب بھی تجھے پکارا
بے اختیار ہو کر میں نے بڑھائیں باہیں

جب زیست ڈھونڈتی تھی آبادیاں، ٹھکانے
اب موت کو جہاں میں ملتی نہیں پناہیں

جاں دے کے اک جہاں کو محبوب ہو گئے ہم
کس کس کو پیار کر لیں کس کس سے داد چاہیں!

کچھ بدگمانیوں نے کانٹے بچھا دئے تھے
مشکل نہ تھیں وگرنہ عہدِ وفا کی راہیں

کیسے فراغ پائیں مصروفِ زندگی سے
تم کو اگر نہ دیکھیں تم کو اگر نہ چاہیں

۱۹۵۴ء

○

کریں گے از سرِ نو داستانِ عشق رقم!
سنبھل کے کوچۂ جاناں میں رکھ رہے ہیں قدم

پسِ نقاب مری سادگی پہ طنز نہ کر
کہ کھل چکا ہے تری شانِ دلبری کا بھرم

وہاں وہاں سے ملا ہے سراغِ منزلِ زیست
جہاں جہاں نظر آئے تمھارے نقشِ قدم

شکست کھا نہ سکا آدمی کا حُسنِ خلوص
وگرنہ کب نہ ہوئی اس پہ انتہائے ستم؟

کتابِ زیست پہ بکھری ہیں خون کی بوندیں!
کہ تم نے کاٹ کے رکھ دی یہاں زبانِ قلم!!

گُلوں کو خندۂ بیباک سے ہے کام جمیلؔ
یہ ہم سے پوچھ کہ روتی ہے کس لیے شبنم؟

۱۹۵۴ء

○

قلزمِ حسن کی لہروں پہ رواں رہتا ہے
آج کل دل مرے پہلو میں کہاں رہتا ہے!

یوں ہے احساس پہ چھایا ہوا صدیوں کا غبار
جیسے محفل میں چراغوں کا دھواں رہتا ہے

جس کے پہلو میں ہو دل، سنگ نہ ہو، خار نہ ہو
کوئی بتلاؤ وہ انسان کہاں رہتا ہے؟

بستیٔ شوق نہ اُجڑی تھی، نہ اُجڑے گی کبھی
کوئی رُت آئے، یہاں ایک سماں رہتا ہے

حسنِ معنی نہ ہو جس طرزِ ادا میں شامل
چند ہی روز وہ اندازِ بیاں رہتا ہے

وقت سے پہلے ہی مر جاتے ہیں وہ لوگ جمیل
جن کو ہر گام پہ اندیشۂ جاں رہتا ہے

۱۹۵۴ء

○

چار سُو ایک، فضا ایک سی تنہائی تھی
ہم سے پہلے یہ کہاں انجمن آرائی تھی!

جل بجھے شمع کی مانند کہیں کیا معلوم!
صبح دم بادِ صبا تیری خبر لائی تھی

کیا خبر راہ میں کس کس سے ملاقات ہوئی
زندگی ورنہ تمہاری ہی طرف آئی تھی

شہر در شہر پھرے قریہ بہ قریہ گھومے
اپنی فطرت بھی تو محبوبۂ ہرجائی تھی!

جھک گئی موسمِ گل میں جو ہوائے غم سے
شاخ تھی یا کوئی ٹوٹی ہوئی انگڑائی تھی؟

انجمن ساز بُتے بھول گئے یوں، جیسے
مجھ سے بڑھ کر مری صورت سے شناسائی تھی

۱۹۵۳ء

○

اِک چاند گگن پر اُبھرا ہے، اک چاند ہے من کے درپن میں
اے شیتل کرنوں تم ہی کہو اب کتنی دیر ہے درشن میں؟

جو آنسو ہے انگارا ہے، اک آگ لگی ہے تن من میں!
یہ آگ ہی جیون جوالا ہے، سکھ چین بھی ہے اس تڑپن میں

یوں نٹ کھٹ چنچل آشائیں ہر دے میں راس رچاتی ہیں
جیسے ہنس مکھ سُندر بالک لہرائیں گھر کے آنگن میں

اُن سپنوں کی یادوں سے من مندر میں جگ، مگ جگ، مگ ہے
جو سپنے میں نے دیکھے تھے اپنے البیلے بچپن میں!

یہ پیار کی بازی کون کہے کس نے جیتی کس نے ہاری؟
میں سوچ میں ہوں تو بھی چپ ہے، جگ بیت گئے اس الجھن میں

وہ جیوتی جیون جیوتی ہے اس گیت میں پریت کا امرت ہے
جو جیوتی اپنے مکھ پر ہے جو گیت ہے دل کی دھڑکن میں!

۱۹۵۵ء

○

چاہیں گے تجھے خواہشِ بیجا نہ کریں گے
ہم عصمتِ احساس کو رُسوا نہ کریں گے

مانگیں گے ترے پیار کا اک لمحۂ جاوید
بس اور کسی شے کا تقاضا نہ کریں گے

کرتے ہیں وہی جو دلِ دیوانہ بتائے
کہتے ہیں ہر اک بار کہ ایسا نہ کریں گے

آنکھیں ہی نہ بن جائیں رقیبِ دلِ ناداں
احباب تو کہتے ہیں کہ چرچا نہ کریں گے

گہری ہے بہت رات ہر اک داغ جلاؤ
یہ چاند ستارے تو اُجالا نہ کریں گے

وہ سنگِ حریفاں ہو کہ غوغائے رقیباں
دیوانے کسی بات کی پروا نہ کریں گے

اب ان سے تخاطب ہے جمیل ان کی زباں میں
کب تک مرا انداز وہ سمجھا نہ کریں گے

۱۹۵۵ء

○

روز و شب کا یہ سلسلہ کیا ہے؟
اس تسلسل کی انتہا کیا ہے؟

دل سمجھتا ہے دل کے سب انداز
عشق میں عرضِ مدعا کیا ہے!

چاہتیں، مسکراہٹیں، آنسو
مختصر زندگی میں کیا کیا ہے!

اُس نے لب سی دیئے زباں دے کر
اور اس سے بڑی سزا کیا ہے؟

ق
کر دیا وا قفس کا دروازہ
یہ نہ دیکھا مری خطا کیا ہے

ہم بھی اے دوستو غنیمت ہیں
ورنہ دُنیا میں اب رہا کیا ہے

آؤ پوچھیں جمیلؔ یاروں سے
آج پہلو میں درد سا کیا ہے

۱۹۵۵ء

○

آوارہ مزاج زندگی نے
جینے کے سکھا دیئے قرینے

دعویٰ تو کیا ہے سب نے لیکن
چاہا ہے تجھے کسی کسی نے!

لگ جائے نہ ٹھیس گل رخوں کو
نازک ہیں بہت یہ آبگینے!

دُنیا کا نہیں ہے دوش کچھ بھی
کھویا ہمیں اپنی سادگی نے

ساحل کا سکوت ڈس رہا تھا
طوفاں سے جا ملے سفینے

۱۹۵۵ء

○

دل کی دل نے نہ کہی یوں تو کئی بار ملے
ہم شناسا تھے مگر صورتِ اغیار ملے

اس سے کہنا کہ نہ اب اور وہ اترا کے چلے
دوستو تم کو اگر یارِ طرحدار ملے

بے وفا ہم ہیں تو اے جانِ وفا یونہی سہی
ڈھونڈھ لینا جو تمھیں کوئی وفادار ملے!

ہم تو دل دے کے بھی دنیا میں اکیلے ہی رہے
جو ہوس کار تھے سب ان کے طرفدار ملے

دل کی قیمت تو محبت کے سوا کچھ بھی نہ تھی
جو ملے صورتِ زیبا کے خریدار ملے

ہم نے کانٹوں کو بھی سینے سے لگا رکھا ہے
خار بھی ہم سے برنگِ گل و گلزار ملے

دوریاں فاصلے ہو جاتے ہیں طے آخر کار
سرِ گلزار جو بچھڑے تھے سرِ دار ملے

سنہ ۱۹۵۵ء

○

ایک دُنیا نے آزمایا ہے
پھر بھی دل سب کے کام آیا ہے

آندھیاں تک نہ بجھا سکیں نہ اسے
ہم نے جو بھی دیا جلایا ہے

زندگی رائیگاں نہیں گزری
تجھ کو کھو کر جہاں کو پایا ہے

ہم نے کیا کیا نہ زخم کھائے ہیں!
دل بہر حال مسکرایا ہے

ہم میں ہمّت کہاں تھی جینے کی
وقت نے حوصلہ بڑھایا ہے

یہ نیا دور اپنے ساتھ جمیلؔ
کتنی خوشیاں سمیٹ لایا ہے!

۱۹۵۱ء

○

اگر وہ جانِ بہار اس طرف بھی آ جاتی
ہزار اُجڑی ہوئی بستیوں کو مہکاتی

کچھ اس وقار سے آتی ہے عصرِ نو کی برات
دھڑک رہی ہے عروسِ حیات کی چھاتی

یہ میکدہ تو کبھی کا سنور گیا ہوتا
اُلجھ گئے مگر آپس میں ہی خراباتی

حیات آ ہی گئی روشنی کے طوفاں میں
کہاں تلک یہ اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی!

غمِ جہاں کو گلے سے لگا لیا آخر
کسی کی یاد کہاں تک جمیل بہلاتی!

۱۹۵۱ء

○

رسن و دار سے ہم پیار کریں یا نہ کریں
آج یوں موت پہ یلغار کریں یا نہ کریں

لب پہ آئی تو ہے اک بات مگر سوچتے ہیں
آپ کے سامنے اظہار کریں یا نہ کریں

عشق کا پاس بھی ہے وقت کا احساس بھی ہے
نگہہِ ناز تجھے پیار کریں یا نہ کریں

جرأتِ شوق پہ خاموش ہیں وہ یوں، جیسے
سوچتے ہیں کہ اب انکار کریں یا نہ کریں

وقت کے ساتھ بدل جائے گا دستورِ جہاں
آپ زحمت مری سرکار کریں یا نہ کریں

آج سے اپنا قلم وقف تو ہے سب کے لئے
برسرِ عام یہ اقرار کریں یا نہ کریں

سنہ ۱۹۵۲ء

○

مزاجِ لالہ و سرو و سمن کا پاس نہیں
وہ باغباں تو ہیں لیکن چمن کا پاس نہیں

نگارِ موسمِ گُل ہم ہیں تیرے دیوانے
غلط، کہ ہم کو ترے بانکپن کا پاس نہیں

انھیں کے دم سے تو ہے چاک پیرہن اپنا
جو کہہ رہے ہیں، ہمیں پیرہن کا پاس نہیں

بصد نیاز چلے آ رہے ہیں پروانے
کسے چراغ سرِ انجمن کا پاس نہیں!

وہ کیا نگارِ سحر کو جواب دیں گے جنھیں
اس آزمائشِ دار و رسن کا پاس نہیں

جمیلؔ ان کا مذاقِ سخن بھی کیا ہوگا
جنھیں لطافتِ شعر و سخن کا پاس نہیں

۱۹۵۲ء

○

آپ ہی جنّتِ موہوم کے حقدار سہی
ہم گنہگار اگر ہیں تو گنہگار سہی

یہ فضاؤں کی جوانی تو ہے اپنے بس میں
وہ مرے نام سے بیزار ہیں، بیزار سہی

میں تو سونپا ہُوا اک فرض سمجھتا ہوں اسے
آپ کے واسطے یہ زندگی آزار سہی

راہ رو منزلِ مقصود پہ ہی دم لیں گے
راہ کتنی ہی کٹھن کتنی ہی پُرخار سہی!

وقت کے تلخ حقائق تو نہیں چُھپ سکتے
ہم پہ اس دَور میں پابندیٔ اظہار سہی

کل نہ ہر گام پہ رسوائی انساں ہوگی
آج جھکتے ہوئے پیکر سرِ بازار سہی

صرف باتوں سے تو یہ رات کٹے گی نہ جمیل
لاکھ اس رات میں بھی صبح کے آثار سہی

۱۹۵۲ء

○

افسانۂ صبحِ عام بھی ہے
لیکن ابھی رنگِ شام بھی ہے

ہم تختۂ دار پر ہیں لیکن
ہونٹوں پہ تمہارا نام بھی ہے

مے اپنے لئے حرام ٹھہری
ان کے لئے اہتمام بھی ہے

طائر ہیں فضا میں محوِ پرواز
گو صحنِ چمن میں دام بھی ہے

طوفان بھی موجزن ہیں اس میں
دل جیسے رُکا خرام بھی ہے

سرود پیرافغان

ہوتے نہیں فیض یاب سارے
کہنے کو صلائے عام بھی ہے

میخانہ سنبھال اپنا ساقی!
رندوں کو کچھ اور کام بھی ہے

۱۹۵۲ء

○

انساں کہ تراشتا ہے راہیں
تسکیں کے لیئے ترس رہا ہے!

دُنیا کو چلے ہیں ساتھ لے کر
تقدیر پہ اپنا بس رہا ہے

اب کے تھا چمن اُداس لیکن
اِک جشنِ قفس قفس رہا ہے

دُنیا ہے لہو لہو مگر تُو!
تاروں کے جہاں میں بس رہا ہے

کیا حُسن کا احترام اس کو!
اک عمر جو بوالہوس رہا ہے

۱۹۵۲ء

○

خاک اور خوں میں ڈوب کر آئی
دیکھنا دیکھنا سحر آئی!

جو چلے تھے جنوں کی راہوں پہ
ان کی صورت نہ پھر نظر آئی!

رہ نوردانِ شوق کیسے ہیں،
راستوں سے کوئی خبر آئی؟

درِ زنداں سے تا بہ حدِ چمن
زندگی آج بے خطر آئی

ہم نہیں رہروانِ راہِ عدم
موت کیا سوچ کر ادھر آئی؟

وہ نشیبوں سے رقص کرتی ہوئی
صبح نو کی کرن ابھر آئی

موت حیرت سے دیکھتی ہے جھجک
زندگی آج اوج پہ آئی !

۱۹۵۲ء

○

وہ انجمنِ طرب نہیں ہے
پہلے تھی جو بات اب نہیں ہے

مستور ہے کیوں مری نظر سے
کیا مجھ کو تری طلب نہیں ہے!

اک روز وہ خود ہی تھام کر دل
آجائیں تو کچھ عجب نہیں ہے

کٹ جائے گی ایک دو نفس میں
ایسی بھی طویل شب نہیں ہے!

مقصد ہے کوئی عظیم اس کا
یہ زندگی بے سبب نہیں ہے

سرود خیال

پہنچی ہے قفس سے آشیاں تک
فریاد جو زیرِ لب نہیں ہے

جس میں نہ ہو زندگی کا پرتو
کچھ اور ہے وہ ادب نہیں ہے

١٩٥٢ء

○

لاکھ احساس ترا کشتۂ حالات رہے
تیرے ہونٹوں پہ شگفتہ سی کوئی بات رہے

تو نے ہر دور میں اُلٹی ہے بساطِ عالم
آج یہ آخری بازی بھی ترے ہات رہے

یہ بھی ملنا ہے کہ بس مل کے بچھڑ جاتے ہیں!
لطف تو جب ہے کہ اک عمر ملاقات رہے

کائنات ان کے لیے ایک سراب ایک خیال
جو نگہبانِ حرمِ محوِ غمِ ذات رہے

یُوں سرِ بزم کوئی نغمۂ جاوید سُنا
کہ ترے بعد بھی محفل میں تری بات رہے!

کیا عجب ایک ہی منزل ہو ہماری اے دوست!
راہ کٹ جائے گی دونوں کا اگر ساتھ رہے

اپنا شیوہ کہ جلاتے ہیں اندھیرے میں چراغ
ان کی سازش کہ زمانے میں یونہی رات رہے

جو لگاتے رہے ہر چال پہ جاں کی بازی
کیوں مجملؔ ان کے مقدر میں فقط مات رہے

۱۹۵۲ء

○

یہ زندگی جو ہر سمت کامگار گئی
حضورِ دوست بڑی سادگی سے ہار گئی

چلے بھی آؤ کہ اہلِ چمن یہ کہتے ہیں
تمہارے ساتھ ہی وہ رونقِ بہار گئی

وہ میرا شوقِ طلب تھا کہ شانِ محبوبی!
کسی کی سمت نظر آج بار بار گئی

سکوتِ مرگ فضائے چمن پہ طاری تھا
صبا بھی اب کے گلستاں سے سوگوار گئی

یہ اور بات ہے تو نے سنا نہیں ورنہ
قدم قدم پہ تجھے زندگی پکار گئی

ہماری کشتیِ دل کا کہیں جواب بھی ہے!
جو ڈوب ڈوب کے لاکھوں کو پار اتار گئی

یہ ناتمام محبّت، یہ ناشگفتہ کلی
تری خوشی کے لیے کتنے غم سہار گئی!

ہمیں ہیں پیرہنِ گل ہمیں ہیں جانِ چمن
جہاں جہاں بھی گئے ہم وہیں بہار گئی

جلو میں کتنی بہاروں کے کارواں تھے جمیل!
چمن کو چھوڑ کے جب زیست سوئے دار گئی

سنہ ۱۹۵۲ء

○

یہ منظر یہ روپ انوکھے سب شہکار ہمارے ہیں
ہم نے اپنے خونِ جگر سے کیا کیا نقش اُبھارے ہیں!

صدیوں کے دل کی دھڑکن ہے ان کی جاگتی آنکھوں میں
یہ جو فلک پہ ہنس مُکھ چنچل جگ مگ جگ مگ تارے ہیں

ایک ذرا سی بھول پہ ہم کو اتنا تُو بدنام نہ کر
ہم نے اپنے گھاؤ چھپا کر تیرے کاج سنوارے ہیں

کچھ باتیں، کچھ راتیں، کچھ برساتیں اپنا سایہ
ماضی کے اندھیارے میں یہ جلتے دیپ ہمارے ہیں

ایک جہاں کی کھوج میں اپنے پیار کی نگری چھوڑ آئے
اور زمانہ یہ سمجھا ہم پیار کی بازی ہارے ہیں

سب سے ہنس کر ملنے والے ہم کو کسی سے بیر نہیں
دُنیا ہے محبوب ہمیں اور ہم دُنیا کو پیارے ہیں

سنہ ۱۹۵۲ء

○

وہ جس نگاہ نے دل کو گناہگار کیا
اسی نے آج سرِ بزم شرمسار کیا

جلے چراغ، بجھے، پھر سے جل گئے لیکن
ہمیں تھا شوقِ طلب، ہم نے انتظار کیا

اُلجھ کے رہ گیا دامن، تو یہ ہُوا معلوم
گلوں کے رُوپ میں کانٹوں سے ہم نے پیار کیا

ازل کی دُھند میں لپٹے ہوئے تھے کون و مکاں
شہاں نے حُسنِ دو عالم کو آشکار کیا

شبِ سیاہ نے دی آمدِ سحر کی نوید
خزاں کے جور سے اندازۂ بہار کیا

جو راستے میں ملا، ساتھ ہو لیا اپنے
وہ دل نواز سفر ہم نے اختیار کیا

جمیل خوں میں نہا کر چمن پرستوں نے
کلی کلی کو شناسائے نو بہار کیا

۱۹۵۲ء

○

ان کی خوشبوؤں کو بھی دوام نہیں
جن کو ہم دل جلوں سے کام نہیں

طائرِ خوش نوا قفس میں سہی
شعلۂ گُل تو زیرِ دام نہیں!

جس کے پہلو میں دن کا نُور نہ ہو
اتنی گہری تو کوئی شام نہیں!

ہم ہیں پیغمبرِ بہار جمیلؔ
کس کے لب پر ہمارا نام نہیں؟

۱۹۵۲ء

O

فاصلے درمیاں کہاں ہوتے
تم اگر میرے راز داں ہوتے

اپنے دم سے ہے روشنی ورنہ
دونوں عالم دھواں دھواں ہوتے

ہم فقیروں کا کیا ٹھکانہ تھا!
آپ اگر میرِ کارواں ہوتے!

تُو نہ ہوتی تو اے نگارِ حیات!
دل میں یہ ولولے کہاں ہوتے!!

وقت کے وہ مزاج داں ہی نہ تھے
ورنہ دنیا کے پاسباں ہوتے

شعلۂ گُل کی بات کیوں کرتے!
سایۂ گُل میں گر جواں ہوتے!!

باغ وہ باغ ہی نہیں ورنہ
اس جگہ کتنے آشیاں ہوتے!

زخمِ دل ہم اگر دکھا سکتے
یوں نہ معتوبِ دوستاں ہوتے

کون سُنتا جمیلؔ اگر ہم لوگ؟
صرف اپنی ہی داستاں ہوتے

۱۹۵۲ء

○

ہو گئے وہ بھی آج بیگانے
رہ گئے دل میں کتنے افسانے!

لے کے ہونٹوں پہ خندۂ بیباک
دوست آئے ہیں مجھ کو سمجھانے

شمع محفل کو کچھ خبر نہ ہوئی
جل بجھے صد ہزار پروانے

ہر کسی کو تھا اپنا اپنا خیال
مُڑ کے دیکھا نہ ہم کو دُنیا نے

کوئی مہماں نہ لوٹ کر آیا
ایسے اُجڑے دلوں کے کاشانے

دل میں رکھ لوں تجھے نگارِ حیات
کیا خبر تُو بھی کل نہ پہچانے!

مصلحت سے خموش ہیں ورنہ
ہوش میں آ چکے ہیں دیوانے

آتے آتے بہار آئے گی!
بستے بستے بسیں گے ویرانے!!

اور کیا چاہیئے جمیلؔ اگر
آدمی آدمی کو پہچانے!

۱۹۵۲ء

○

شامِ زنداں اُداس تنہائی
ہائے کس وقت تیری یاد آئی!

کیا ڈبوئے گی اس کو طغیانی
جس نے موجوں میں پرورش پائی

اس سے آگے بھی ہے مقام کوئی؟
دار تک تو حیات لے آئی

کیا وہ جیتیں گے وقت کی بازی!
عمر بھر جو رہے تماشائی

چھپ گئی ہے کہاں عروسِ بہار؟
پوچھتے پھر رہے ہیں سودائی

ہم ہیں وہ آفتابِ نو کہ جمیلؔ!
ہم سے لاکھوں نے روشنی پائی

۱۹۵۲ء

○

بزمِ دُنیا پہ کیف یہاں زیست کا انداز نہیں
عرصۂ دہر ہے یہ انجمنِ ناز نہیں

کوئی آئے تو سہی، جام اٹھائے تو سہی!
کس پہ میخانۂ امروز کا در باز نہیں!!

مطربِ زیست بڑی دیر سے ہے نغمہ سرا
ہائے وہ لوگ کہ جو گوش بر آواز نہیں!

کونسی سوچ میں ہو نغمہ گرو، ہم نفسو!
آج محفل میں کہیں سوز نہیں ساز نہیں

کون دُہرائے گا دنیا میں فسانہ ان کا!
جن کی اِس دَور میں اپنی کوئی آواز نہیں

آؤ لے آئیں ہمیں چاند ستاروں کی خبر
ہم صفیروں میں اگر جرأتِ پرواز نہیں

دونوں عالم ترے قدموں میں بچھے جاتے ہیں
یہ ترے پیار کی عظمت کا تو اعجاز نہیں!

۱۹۵۲ء

○

شب کی پُر ہول ظُلمتوں سے نہ ڈر
آنے والی سحر پہ ایک نظر!

جتنی نزدیک آ رہی ہے سحر!
شب کے سینے میں پڑ رہے ہیں بھنور

دے رہے ہیں پیامِ عہدِ طرب
مُہر بر لب نہیں یہ شام و سحر

اتنا خوب ہو تو بات بھی ہے
کٹ تو جاتا ہے زندگی کا سفر

بے رُخی ہم وفا شعاروں سے
نگہہِ زیست کچھ خیال تو کر!

ماہ و انجم کی بات رہنے دو
حُسنِ انساں ہے اپنے پیشِ نظر

تشنگی دل کی بجھ نہ جائے کہیں
اے نگارِ چمن کچھ اور سنوَر

عظمتِ گُل تو غیر فانی ہے
پیکرِ گُل ہے بے ثبات اگر

جب تک آنکھوں میں نُور باقی ہے
گُل نہ ہوں گے جمیل شمس و قمر

۱۹۵۳ء

○

دیر و حرم کی راہ سے ہو کر میخانوں تک پہنچیں گے
شیخ و برہمن آخر اک دن انسانوں تک پہنچیں گے

گلچیں اور صیّاد کی سازش کلیوں کے دل مسلے گی
کاکلِ پیچاں کے متوالے زندانوں تک پہنچیں گے

کون سئے گا دامنِ گیتی، چارۂ وحشت کیا ہو گا
ہاتھ اگر اُٹھ کر اپنے ہی دامانوں تک پہنچیں گے

صحرا صحرا جو دیوانے چاک گریباں پھرتے ہیں
ڈھونڈیں گے وحشت کا مداوا فرزانوں تک پہنچیں گے

ہوش میں ان کو آجانے دو خاک بسر یہ دیوانے
پھولوں کی مہکاریں لے کر ویرانوں تک پہنچیں گے

۱۹۵۳ء

○

ہو گا، مگر ایسا رُخِ زیبا تو نہیں ہے
محبوبۂ گیتی کوئی تجھ سا تو نہیں ہے

دُنیا پہ نہ کُھل جائے کہیں حالِ دلِ زار
کچھ میری نگاہوں سے ہویدا تو نہیں ہے

وہ سامنے بیٹھے ہیں کہ گلزار کِھلا ہے
آج اپنی نظر پر مجھے دھوکا تو نہیں ہے

فرصت ہی نہیں ہے غمِ ایّام کے ہاتھوں
میں تجھ سے خفا ہوں، نہیں ایسا تو نہیں ہے

رہ رہ کے اُبھرتی ہیں پُر اسرار صدائیں
ماحول میں طوفاں کوئی برپا تو نہیں ہے

سمجھیں تو یہی درد ہے ہر زخم کا مرہم
کہنے کو غمِ دہر مسیحا تو نہیں ہے

ہر شاخ سے پھوٹیں گے کئی تازہ شگوفے
یہ زیست چمن زار ہے صحرا تو نہیں ہے

اک قافلۂ جہد و عمل ساتھ ہے اپنے
دنیا میں جمیلؔ آج اکیلا تو نہیں ہے

سنہ ۱۹۵۳ء

○

جن کے دم سے زندگی تھی کامراں
سو گئے اے دل وہ ہنگامے کہاں

اپنی منزل اِن سے کوسوں دُور ہے
دیر و کعبہ ہو کہ تیرا آستاں

عظمتِ آدم کے آگے سجدہ ریز
یہ زمیں، یہ وسعتیں، یہ آسماں

کتنی پارینہ مگر کتنی حسیں!
زندگی اور زندگی کی داستاں

بڑھ کے طوفانوں سے ٹکرائی حیات!
تا بہ کے ساحل پہ چُنتی سیپیاں!

منزلیں بھی گرد ہو کر رہ گئیں
ولولے تھے کارواں در کارواں

کچھ ترے جلووں نے دکھلائی بہار
رنگ لایا کچھ مرا حُسنِ بیاں

۱۹۵۳ء

○

آنکھ جھپکی اُجڑ گئے گُلشن
شامِ غُربت ہے یہ کہ صبحِ وطن

اب کے فصلِ بہار یُوں آئی
جل بجھے صد ہزار شعلہ بدن

کیسا گُلشن ہے یہ کہ ہر جانب
چاک ہیں گلرُخوں کے پیراہن!

نخلۂ گُل بنا ہے تختۂ دار
کیا سے کیا ہو گئی ہے رسمِ چمن!

رات بوجھل، مہیب سنّاٹا
کوئی نغمہ، کوئی جمیل کرن!

ظلمتیں بُن رہی ہیں نُور کا جال
شب کے سینے میں ہے لطیف چُبھن

حرفِ مطلب سُنا دیا ہم نے
گو ہمیں مل سکا نہ اذنِ سُخن!

۱۹۵۳ء

○

جو بھی در پردہ ستم ہم پہ ہوا دیکھ چکے
کتنے پُر کار ہیں اربابِ وفا، دیکھ چکے

بُوند پانی بھی کہیں وسعتِ صحرا میں نہیں
کیسے گلشن پہ برستی ہے گھٹا دیکھ چکے

کیسے ہر شاخ کے سینے سے دُھواں اُٹھتا ہے
کِس طرح آگ لگاتی ہے صبا دیکھ چکے

ان سہاروں میں بھی تسکین کی صُورت نہ ملی
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا دیکھ چکے

تو نے تو پیار کی منزل ہی دکھائی تھی کبھی
منزلیں اور بھی ہم اس کے سوا دیکھ چکے

فن کی عظمت سے ہے تزئینِ نگارِ گیتی
یُوں تو ہم رنگِ شفق رنگِ حنا دیکھ چکے

دونوں احساس کی نبضوں کو سُلا دیتے ہیں
سایۂ گُل ہو کہ زُلفوں کی گھٹا دیکھ چکے

جیت اس کی ہے جو منزل کی خبر بھی لائے
راہِ ہستی میں کئی آبلہ پا دیکھ چکے

ایک دن ساحلِ اُمید بھی دیکھیں گے جمیلؔ
قعرِ دریا میں گئے سیلِ بلا دیکھ چکے!

۱۹۵۳ء

○

زیست کو مل ہی گیا شوخ سا عنواں کوئی
ورنہ ہم سا بھی نہ تھا بے سروساماں کوئی

صبح کا جلوۂ گل رنگ ہے یا تیرا بدن!
تیری رفتار ہے یا سروِ خراماں کوئی!!

اس سے پہلے تو یہ عالم کبھی دیکھا ہی نہ تھا
کر گیا دل کے اندھیرے میں چراغاں کوئی

پیکرِ غم ہوں مجھے ساتھ بہا کر لے جائے
نورِ خورشید ہو یا سیلِ بہاراں کوئی

دفن ہو کر بھی دیئے ہم نے جلائے ورنہ
اتنا پُر نور نہ تھا شہرِ خموشاں کوئی

تا بہ کے دار و رسن، ہم بھی وہاں پہنچیں گے
نہ جہاں طوق و سلاسل ہیں نہ زنداں کوئی

موت گھبرا کے کسی غار میں چھپ جاتی ہے!
جب بھی لیتا ہے جنم دہر میں انساں کوئی

بیکراں وقت کی آہٹ سے گماں ہوتا ہے
موجزن سینۂ گیتی میں ہے طوفاں کوئی

لوٹ آئے انھیں شہروں کی کشاکش میں جمیل
راس آیا نہ ہمیں دشت و بیاباں کوئی

۱۹۵۳ء

○

نظریں ہیں بلند، دل کشادہ
ہم لوگ ہیں زیست کا لبادہ

آتا ہے زباں پہ نام تیرا
ہوتا ہے گناہ بے ارادہ

دُنیا ہے بڑی ہی خوبصورت
لیکن وہ کسی کا حُسنِ سادہ!

لاکھوں نے نئی اُمنگ پائی
کچھ لوگ رہے رہینِ بادہ

یوں سیلِ بلا میں ہم کھڑے ہیں
جیسے ہو چٹان ایستادہ!

قدموں کے نشاں تو دیکھتے ہیں
ہموار نہیں اگرچہ جادہ

آ جائیں فریبِ قیصری میں
ایسے بھی نہیں ہیں لوگ سادہ!

۱۹۵۴ء

○

ساغر کسی میخوار کا بھرپور نہیں ہے
شاید یہ تری بزم کا دستور نہیں ہے

محسوس یہ ہوتا ہے ستاروں کے سفر سے
اب قافلۂ نورِ سحر دُور نہیں ہے

رِستا نہیں، کھلتے ہیں یہاں پھول شب و روز
پہلو میں چمن ہے کوئی ناسور نہیں ہے

جینے کا سلیقہ ہے نہ مرنے کا قرینہ!
اس شہر میں کیا کوئی بھی منصور نہیں ہے؟

اس جرم پہ اپنے بھی سمجھتے ہیں ہمیں غیر
اپنوں کی تباہی ہمیں منظور نہیں ہے

مستقبلِ انساں ہے نگاہوں سے بہت دُور
لیکن مرے ادراک سے کچھ دُور نہیں ہے

سنہ ۱۹۵۲ء

○

جسم شاداب، مہکتے ہُوئے لب دیکھیں گے
زندگی ہے تو کبھی عہدِ طرب دیکھیں گے

جانے اس وقت غمِ زیست پہ کیا گزرے گی!
نیم خوابیدہ نگاہوں سے وہ جب دیکھیں گے

اُس طرف جُنبشِ مژگاں بھی گوارہ نہ ہوئی
اور ادھر وہم کہ اب دیکھیں گے اب دیکھیں گے

ان کو یاد آئے گا اپنا بھی فسانہ کوئی
دیکھنے والے ہمیں غور سے جب دیکھیں گے

کیا خبر تھی ہمیں لائے گی وہاں بادِ صبا
ہر شگوفے کو جہاں مُہر بہ لب دیکھیں گے

ابھی ٹوٹا ہی کہاں ہے شبِ ہستی کا طلسم!
ابھی اک اور بھی ہنگامۂ شب دیکھیں گے

ان کی جاگیر سہی صبح کی اُجلی تنویر
ایک دن حسنِ جہاں تاب کو سب دیکھیں گے

۱۹۵۳ء

○

کھلا کھلا سا ہر اک گام پر چمن دیکھا
تمہارے شہر کی گلیوں کا بانکپن دیکھا

جو اپنی سمت نظر کی تو دل کے پاس ملا
دمن دمن جسے ڈھونڈا چمن چمن دیکھا

تجھی سے محفل کون و مکاں ہیں ہنگامے
کہاں کہاں نہ تجھے جانِ انجمن دیکھا!

ہماری قدر جو ہونا تھی سو ہوئی، لیکن
لٹا لٹا سا تجھے بھی عروسِ فن دیکھا

نہیں تھا اذنِ تکلم مگر سرِ مقتل
ہر ایک دل میں تلاطم سا موجزن دیکھا

سرو چراغاں

یہ خوابناکی و مستی، یہ شورِ بربط و چنگ
کبھی حضور نے دُنیا کا بھی چلن دیکھا؟

چلو جمیل بدل دیں جنوں کی رسمِ کہن
سبھی کو خاک بسر چاک پیرہن دیکھا

سنہ ۱۹۵۴ء

○

عہدِ نو ان کے لیے کب آیا
زندگی کا نہ جنھیں ڈھب آیا

منزلِ صبح پہ آکر ٹھہرا
دُور سے قافلۂ شب آیا

اس سے کیا کیا نہ کریں گے باتیں!
اس طرف شاہدِ گُل جب آیا

تھے وہی محرمِ اسرارِ طلب
تجھ سے ملنے کا جنھیں ڈھب آیا

کب سے بیٹھے ہیں تری راہ میں ہم
اور اس راہ سے تُو اب آیا!

نام ان کا بھی لیا یاروں نے
ذکر محفل میں مرا جب آیا

۱۹۵۴ء

○

تم بھی ان کو نہ اگر پیار سے دیکھا کرتے
لوگ کس بات پہ جینے کی تمنا کرتے!

ہم کو فرصت نہ ملی ورنہ تمنا تو یہ تھی
کوبہ کو قریہ بہ قریہ ترا چرچا کرتے

کون مجرم ہے زمانے کو خبر تو ہوتی
برسرِ عام ہمیں کاش وہ رُسوا کرتے

نقدِ دل پاس تھا سو وہ انھیں منظور نہ تھا
ہم تہی جیب تھے کیا حُسن کا سودا کرتے

دیدہ و دل کے لیئے اور بھی ہنگامے تھے
تجھ سے کیا دردِ محبت کا تقاضا کرتے!

وقت کے پاس ہی اعجازِ مسیحائی ہے
تم بھی کیا کاہشِ پنہاں کا مداوا کرتے!

سرنگوں، آہ بہ لب، خاک بسر کیوں پھرتے
آپ اگر کوششِ انساں پہ بھروسا کرتے

بحر میں ڈوب کے طوفاں کی خبر لائے ہیں
تا بہ کے دُور سے موجوں کا تماشا کرتے!

عمر تھوڑی تھی جمیلؔ اور تقاضے تھے بہت
جیتے رہتے تو ابھی اور نہ کیا کیا کرتے

۱۹۵۴ء

○

ایک دُنیا کو ہو گئے محبُوب
جو ترے نام سے ہوئے منسُوب

موت کا ایک رنگ، ایک ہی رُوپ
زندگی کے ہزارہا اسلوب

لوگ تو ہم کو پیار کرتے ہیں
ان کی نظروں میں ہم سہی معتوب

چاہتے تھے خلوص دُنیا سے
اور تو کچھ نہ تھا ہمیں مطلوب

یہ بھی دیکھا کہ جرم پیرِ مُغاں
مے گُساروں سے ہو گیا منسُوب

دونوں پیوست ہیں رگِ جاں میں
دشنۂ دہر، غمزۂ محبوب

دوست یکرنگیٔ بیاں کب تک!
اور بھی چاہیے کوئی اسلوب!

لو لگائی ہے جس نے لوگوں سے
ہوگا کوئی جمیلؔ سا مجذوب!

۱۹۵۴ء

○

تو آج رُوٹھ کے کن بستیوں کی سمت چلی!
اُجڑ نہ جائے ترے بعد میرے دل کی گلی

تمھیں کہو اُسے مرنا کہاں گوارہ ہے
وہ آرزو کہ مری زندگی کے ساتھ پلی

وہ شمع بجھ کے بھی روشن ہے بزمِ ہستی میں
جو انتظارِ سحر میں تمام رات جلی

رواں رہیں گے یونہی قافلے بہاروں کے
ہمارے بعد بھی مہکے گی زندگی کی کلی

نہ جانے کب سے شبستاں میں جل رہے ہیں چراغ!
نہ آپ آئے نہ یہ شامِ انتظار ڈھلی

جو مصلحت کے پجاری تھے ساتھ چھوڑ گئے
تری طلب تھی کہ اس دل کے ساتھ ساتھ چلی

جمیلؔ ان کو نہیں اعتبارِ جبرِ حیات
جو کہہ رہے ہیں کہ اس زندگی سے موت بھلی

۱۹۵۴ء

○

نغمہ کیوں ہوش ربا ہے یارو!
شعلۂ ساز میں کیا ہے یارو!!

دل کی دھڑکن میں ہے کس کی آواز!
کون سانسوں میں چھپا ہے یارو!!

دیکھ کر ان کو اڑا جاتا ہے!
رنگ بھی موجِ ہوا ہے یارو

یادِ جاناں بھی یہیں رہتی ہے!
آئینہ رنگِ فضا ہے یارو

چوٹ کھائی ہے نظر نے لیکن
درد پہلو میں اُٹھا ہے یارو

رات کی بات ہے رہ جاؤ یہیں!
دل شبستانِ وفا ہے یارو

ہر طرف آہ و بکا ہے یارو
کس قیامت کی فضا ہے یارو

زیست پر موت کا ہوتا ہے گماں
جان کیوں تن سے جُدا ہے یارو؟

ان پہ اُٹھتی ہیں جہاں کی نظریں
کوئی اپنا بھی خُدا ہے یارو؟

کس قدر گرم ہوا چلتی ہے
کوئی پیغامِ صبا ہے یارو؟

مر مٹے پر نہ ملیں چین آیا
زندگی کس کی ادا ہے یارو!

دُور سے آتی ہے مدھم آواز
کیا کوئی بانگِ درا ہے یارو

جذبہ سینے میں پلا ہے برسوں
تب کہیں شعر ہُوا ہے یارو

سنہ ۱۹۵۴ء

○

دیکھ لے اے خدائے ہر دو جہاں!
موت سے بھی اُلجھ گیا انساں

میں تنہا اور اک ہجومِ ہم سفراں
راہ دشوار ہو گئی آساں

دیکھنا تو بہار کے انداز!
اُٹھ رہا ہے چمن چمن سے دھواں

اے غمِ زندگی بتا تجھ کو!
دشمنِ جاں کہیں کہ راحتِ جاں

مصلحت نے یہ گُل کھلائے ہیں
ورنہ دل کا بُرا نہیں انساں

اب نیا ساز ہے نئی آواز
زندگی کے بدل گئے عنواں

ہم زمانے کے دل میں بستے ہیں
بس یہی ہے ہمارا نام و نشاں

جتنی دلکش حیاتِ انساں ہے
اتنی رنگیں حدیثِ شعر کہاں

سنہ ۱۹۵۴ء

○

ہر ایک سلطنتِ دل کے شہریار تھے ہم
زمانے بھر کی نگاہوں سے آشکار تھے ہم

گلوں سے چھیڑ بھی کی، بلبلوں میں بھی چہکے
کبھی نسیم کبھی نغمۂ ہزار تھے ہم

قرار بن کے رہے دو جہاں کے سینے میں
اگرچہ صُورتِ سیماب بے قرار تھے ہم

زبانِ شوق سے کس کس کی داستاں نہ کہی!
کہاں کہاں نہ محبت میں کامگار تھے ہم!!

جسے چھُوا اسے گلشن کا رنگ رُوپ دیا
ز فرق تا بہ قدم جلوۂ بہار تھے ہم

خیالِ یار تو تھا کاروبارِ دل، ورنہ!
نگارِ زیست ترے حُسن پر نثار رہے ہم

ہماری چاپ سے جاگی چمن چمن کی فضا
جمیل قافلۂ صبحِ نوبہار رہے ہم

۱۹۵۴ء

○

جب سے اے جانِ جہاں کوئی بھی تجھ سا نہ رہا
شہر در شہر مرے پیار کا چرچا نہ رہا

کیا سے کیا ہو گئے دُنیائے وفا کے انداز!
وہ غمِ دل نہ رہا، وہ رُخِ زیبا نہ رہا

حُسنِ یُوسف کے خریدار کہاں سے آئیں
جذبۂ شوق لُٹا، عشقِ زلیخا نہ رہا

حُسن اور عشق کے چہروں پہ ہوس رقصندہ
آج دونوں میں کوئی چاہنے والا نہ رہا

یُوں ہے اندھیر بپا دھر کے بُت خانوں میں
جیسے دُنیا میں کہیں دیدۂ بینا نہ رہا

ذہن بکتے رہے لُٹتا رہا احساسِ جمال
شہر یاروں کو مگر پاس کسی کا نہ رہا

ق

جب سرِ محفلِ شب ہم نے جلائی شمعیں
جگمگا اُٹھے در و بام اندھیرا نہ رہا

ہم نے سکھلائے زمانے کو نخرد کے آداب
کھل اُٹھے کتنے چمن کوئی بھی صحرا نہ رہا!

بن گئے سب کے لیے مرہمِ دل راحتِ جاں
لوگ کہتے تھے کہ اعجازِ مسیحا نہ رہا

مٹ گئی قلب و نظر، جذب و اثر کی دوری
محفلِ حسن سجی، عشق بھی تنہا نہ رہا

آخر انسان سے انساں کی ملاقات ہوئی
قلب و گفتار میں حائل کوئی پردا نہ رہا

۱۹۵۴ء

○

کون سے درد کا درماں نہ ہوئے!
ہم پہ کب آپ کے احساں نہ ہوئے!!

صورتِ آئینہ شفّاف تھا دل
ہم گناہوں پہ پشیماں نہ ہوئے

اور سب کچھ تو ہوئے آپ مگر
ایک دردِ دلِ انساں نہ ہوئے

ہم نے جینے کے قرینے سیکھے
تم سے مرنے کے بھی ساماں نہ ہوئے

رات بھر شمع کی مانند جلے
ہم اندھیروں کے ثنا خواں نہ ہوئے

روح میں تاب و تواں رکھتے ہوئے
شدّتِ غم سے ہراساں نہ ہوئے

اپنی صُورت سے شناسائی تھی
آئینہ دیکھ کے حیراں نہ ہوئے

عمر بھر رسم ملاقات چلی
ان سے کب وعدہ و پیماں نہ ہوئے!

کوئی فریاد تھی یا ھنگامہ؟
دوست کیوں آج غزل خواں نہ ہوئے!

فن میں تاثیر نہ آئے گی جمیل
غم اگر جزوِ رگِ جاں نہ ہوئے

۱۹۵۴ء

○

قلب و احساس کی توہین گوارا نہ کرو
حسن خود بین و خود آرا کو پکارا نہ کرو

مجھ کو لے جاؤ نہ اب کوچۂ جاناں کی طرف
دوستو مجھ پہ یہ احسان خدارا نہ کرو

ساتھ دینا ہے تو پھر رنگ محل سے اترو
بام پہ آکے مسافر کو اشارا نہ کرو

زخم خوردہ دلِ گیتی میں بھی جھانکو یارو!
صرف حالات کی تصویر اُتارا نہ کرو

منزلیں بولتی ہیں، راستے کہتے ہیں جمیلؔ
زندگانی کی کشاکش سے کنارا نہ کرو

سنہ ۱۹۵۴ء

○

کون جانے کہ ماجرا کیا ہے!
دل کو دل آشنا سمجھتا ہے

گھلتی جاتی ہے شام رنگوں میں
کتنا سحر آفریں دھندلکا ہے!

زندگی پر ہے گیت کا دھوکا
کوئی نس نس میں نغمہ پیرا ہے

کر رہا ہے نفس نفس کا شمار
دل میں چھپ کر یہ کون بیٹھا ہے؟

اپنی صورت پہ ہے گماں جیسے
یہ بھی تیرا ہی روئے زیبا ہے

قرب کی ہے یہ کونسی منزل
حال اپنا بھی تم سے پوچھا ہے

ہم تو سادہ مزاج تھے ہی مگر
وہ بھی تو سادگی میں یکتا ہے

عشق پیشہ تھے جو کہاں ہیں وہ؟
کوچے کوچے میں حُسن رُسوا ہے

کیا تھے ہم اور کیا بنائے گئے!
ہم کو دُنیا نے خوب سمجھا ہے!!

ہر خزاں میں بہار کا پر تو
ہر اندھیرے سے نور پیدا ہے

زندگی چاہتی ہے کیا کیا کچھ
ہر قدم پر نیا تقاضا ہے

تُم وہاں گُم یہاں میں گرمِ سفر
وہ تمھاری، یہ اپنی دُنیا ہے

سرودِ جاناں

اتنے بے دست و پا نہیں ہم لوگ
کچھ ہمارا بھی زور چلتا ہے

یہ جہاں چھوڑ کر کہاں جائیں!
یہ جہاں مسکنِ تمنّا ہے

ہم کو دیکھو ہماری صورت سے
منزلوں کا سُراغ ملتا ہے

ذکر تیرا ہے یا زمانے کا
میرے ہونٹوں پہ نام کس کا ہے

حُسن کہتے ہیں جس کو لوگ جمیل
وہ مرے ذہن کا اُجالا ہے

۱۹۵۴ء

○

اسلوبِ نظر، حسن سُخن یاد رہے گا
دل کو ترا بے ساختہ پن یاد رہے گا

بھُولے گی نہ برسوں تری محجوب نگاہی
لَو دیتا ہُوا نرم بدن یاد رہے گا

ہر گام پہ سو حشر اُٹھاتے ہوئے فتنے
وہ رقصِ غزالانِ ختن یاد رہے گا

سانسوں سے بھی تیری ہی مہک آتی رہے گی
جب تک ترے جلووں کا چمن یاد رہے گا

شکوہ نہیں کرتے مگر اے جانِ تمنّا
ہم کو ترا ایک ایک سُخن یاد رہے گا

یہ تذکرۂ دار و رسن یاد رہے گا
کس حال میں ہیں اہلِ وطن، یاد رہے گا

اے شاہدِ گل، عیسیٰ دوراں ترے ہوتے
پھولوں نے جو اوڑھا ہے کفن یاد رہے گا

جب اپنے وطن میں نہ ملا کوئی ٹھکانہ
کیا سایۂ دامانِ وطن یاد رہے گا!

کس محشرِ ہستی میں ہمیں چھوڑ گیا ہے!
یہ گردشِ دوراں کا چلن یاد رہے گا

دُنیا کی اگر اس میں کوئی بات نہ ہو گی
کس کو یہ ادب، کس کو یہ فن یاد رہے گا؟

سنہ ۱۹۵۵ء

○

پھر شاخ سے پھول ہل رہا ہے
دامانِ بہار سِل رہا ہے

جائے گا کہاں یہ دل کہ برسوں!
ہمسایۂ آب و گِل رہا ہے

گلچیں کی نظر سے بچ گیا تھا
اک پھول خزاں میں کِھل رہا ہے

تکریمِ خرد بجا — مگر دل!
ہر بات میں جو مخل رہا ہے!!

جاگا ہے شعورِ راہ و منزل
صدیوں کا سُراغ مِل رہا ہے

وہ پھول جمیل اب کہاں ہے
جو پھول چمن کا دِل رہا ہے

۱۹۵۵ء

○

گلوں کے حسن بہاروں کے بانکپن میں رہے
برنگِ شعلہ رہے جب تلک چمن میں رہے

چمن سے نکلے تو ہم اوجِ دار تک پہنچے
تمام عمر رفیقوں کی انجمن میں رہے

امیرِ شہر کا جادو نہ چل سکا ہم پر
غریبِ شہر تھے پھر بھی دلِ وطن میں رہے

بہار آئی تو ہے پیرہن کی فکر ہے کیا!
بلا سے جاں بھی ہماری اگر نہ تن میں رہے

اِدھر جنوں کو شکایت تھی نازِ بیجا سے
اُدھر ہزار سخن پردۂ سخن میں رہے

اور اس میں شامل کر دا روں
اعانے تو یہ بہت

اگر ہم آج وہاں در خورِ نگاہ نہیں
تو اپنا ذکر بھی کیوں ان کی انجمن میں رہے

رُخِ حیات سے نظریں نہ ہٹ سکیں اپنی
اگرچہ ہم بھی نگارانِ حسن و فن میں رہے

جمیلِ دشت و دمن کس قدر اُجڑ جائیں
نہ کوئی چاک اگر دل کے پیرہن میں رہے

١٩٥٥ء

○

بچھڑے ہُوئے مُسافر منزل پہ جا ملیں گے
مٹ جائے گی یہ دُوری جب آشنا ملیں گے

اس زیست کے سفر میں کتنی ہی منزلیں ہیں
کچھ اور ہم سفر بھی تیرے سوا ملیں گے

دو روز کی جُدائی اور یہ سُلگتے آنسُو!
جیتے رہے تو پھر بھی ہم بارہا ملیں گے

جن کو ہے پاسِ منزل وہ ساتھ ہیں ہمارے
جو لوگ کٹ چکے ہیں وہ ہم سے کیا ملیں گے!

کس کو کروگے سجدہ مانگو گے کس سے جنّت!
دُنیا کے بتکدے میں لاکھوں خدا ملیں گے

عنقا سہی جہاں میں وہ دائمی مسرت
کل ہر قدم پہ ہم کو کتنے ہما ملیں گے!

ہم پھول ہیں چمن کے آئیں گے پھر چمن میں
تجھ سے لپٹ کے اک دن بادِ صبا ملیں گے

تاریکیِ قفس ہو یا کُنجِ گلستاں ہو
ہم مطربانِ گیتی نغمہ سرا ملیں گے

سنہ ۱۹۵۴ء

○

حسن میرے ہی دلِ آئینہ بردار میں ہے
تجھ میں وہ بات کہاں ہے جو مرے پیار میں ہے

تیرا ہر زخم امانت ہے مرے سینے میں
تیرا ہر اشک مرے دیدۂ خونبار میں ہے

عشق کی راہ کٹھن ہے مگر اے ہم سفرو!
جانِ گلزار ابھی اس وادیٔ پُرخار میں ہے

تابِ دیدار اگر ہو تو نظر آتی ہے
وہ حقیقت کہ ابھی پردۂ اسرار میں ہے

رنگ بن کر چمنستاں کو جلا دیتی ہے
آتشِ شوق جو پوشیدہ خس و خار میں ہے

کیا عجب میرے لبوں پر بھی مچل جائے جمیلؔ
وہ جو اک نغمۂ پنہاں سینۂ اظہار میں ہے

۱۹۵۵ء

○

یوں اپنا سراغ پا لیا ہے
ہر ذرّے کو دل بنا لیا ہے

ہستی کو رفیقِ جاں سمجھ کر
ہر غم کو گلے لگا لیا ہے

یہ میری وفا کے آئینے ہیں
پلکوں پہ جنھیں سجا لیا ہے

احساس کو مل گئی ہیں آنکھیں
اک بار فریب کھا لیا ہے

بینا ہے نگاہ، دل غزل خواں
کیا کیا نہ جمیل پا لیا ہے!

سنہ ۱۹۵۵ء

○

ان سے پھولوں کی ہمیں باس آئی
جن کو زنداں کی ہوا راس آئی

بوئے فردا سے معطّر ہے دماغ
دُور کی باس مرے پاس آئی

رچ گئی میرے تنفّس میں بہار
آج یوں اُڑ کے تری باس آئی

زندگی ایک تسلسل ہے مگر
زندگی کس کو یہاں راس آئی!

دل کبھی ماہیِ بے آب رہا
کچھ کے آنکھوں میں کبھی پیاس آئی

دل سے کیا کیا نہ لپٹ کے روئی
جب تری یاد مرے پاس آئی

یاس بیٹھی تھی بچھائے ہوئے جال
دل میں چھپ چھپ کے جمیل آس آئی

۱۹۵۵ء

○

چاند سا آ بسا نگاہوں میں
روشنی ہو رہی ہے راہوں میں

وہ صبا بن کے پاس سے گزرے
پھول سے کھل گئے نگاہوں میں

کر کے وابستہ عارض و لب سے
رنگ سا بھر دیا گناہوں میں

دیکھ پھر تجھ کو کیا نہیں ملتا!
آ ذرا شب کی بارگاہوں میں

اور ہے کون کون شیدائی
بن کے بیٹھے ہو دادخواہوں میں

ڈھونڈتے ہی رہے جہاں والے
چھپ گئے ہم تری نگاہوں میں

تیرے قدموں میں ہم چلے آئے
زندگی آ گئی پناہوں میں

جو نہ دار و رسن سے کھیل سکے
جھول جاتا ہے تری باہوں میں

خیر ہو میرے آستانے کی
اب ہیں وہ بھی جہاں پناہوں میں

۱۹۵۹ء

○

وہی دیا بھی اسے جس نے جو سوال کیا
ہمارے ذوقِ نظر کا نہ کچھ خیال کیا

کوئی جواب نہ تھا اپنے پاس جب تم نے
جھکی جھکی سی نگاہوں سے عرضِ حال کیا

ترے وصال کے لمحے ابھر ابھر آئے
ترے فراق سے جب ذکرِ ماہ و سال کیا

تمھیں تو خیر خبر ہی نہیں مگر دل نے
تمھاری یاد میں کیا کیا نہ اپنا حال کیا!

غمِ حیات سے پہلے ہی دل گرفتہ تھے
ترے خیال نے جی اور بھی نڈھال کیا

چلی جو بادِ خزاں تو چمن میں کس کس نے
مرے خلوص کی کلیوں کو پائمال کیا!

جو غم جمیل مری زندگی کا حاصل تھا
اُسے بھی جان فدا کرکے لازوال کیا

۱۹۵۷ء

○

سر پہ الزام لیا ہے ہم نے
جب ترا نام لیا ہے ہم نے

بیش قیمت ہے یہ موتی لیکن
دل تو بے دام لیا ہے ہم نے

اُس کو تسکین ملی ہے کیا کیا
جو بھی دل تھام لیا ہے ہم نے

بوالہوس دیکھئے کیا کہتے ہیں؟
حُسن کا نام لیا ہے ہم نے

سخت راہوں پہ سنبھلنے کے لیئے
دم بہ ہر گام لیا ہے ہم نے

کیوں نہ اب رقص کرے میخانہ!
ہاتھ میں جام لیا ہے ہم نے

دو جہاں دل میں سمٹ آئے ہیں
دل سے جب کام لیا ہے ہم نے

۱۹۵۴ء

○

رُخِ تدبیر پہ کیا ظلم کیئے جاتی ہے!
میری تقدیر کے سب چاک سیئے جاتی ہے

عنبر و عود میں نہلائی ہوئی شہزادی
کتنی صدیوں سے مرا خون پیئے جاتی ہے!

راہ دشوار ہے منزل ہے بہت دور مگر
کششِ ہمسفراں ساتھ لیئے جاتی ہے

روز کرتے ہیں علاجِ غمِ انساں ہم لوگ
زندگی روز نئے زخم دیئے جاتی ہے

آگ سی پھیلتی جاتی ہے صنم خانوں میں
آذری، شعلہ فشاں ہونٹ سیئے جاتی ہے

۱۹۵۴ء

○

تجھ کو دُنیا سے چھپاؤں تو چھپا بھی نہ سکوں
پردۂ شوق اٹھاؤں تو اُٹھا بھی نہ سکوں

شوق جب حد سے سوا ہو تو خود آ جاتے ہیں
بے طلب اُن کو بلاؤں تو بلا بھی نہ سکوں

کتنے بے نام سے نغمے ہیں پسِ پردۂ ساز!
تُو جو چاہے کہ سناؤں تو سنا بھی نہ سکوں

ایک اِک رنگ میں ہے کتنے ہی رنگوں کی بہار
تیری جلوت میں سماؤں تو سما بھی نہ سکوں

تیرے ہونٹوں سے بکھرتی ہوئی نورس کلیاں
اپنی پلکوں سے اُٹھاؤں تو اُٹھا بھی نہ سکوں

تیرے ایک ایک سخن پر ہیں وفا کی مُہریں
میں کوئی بات بناؤں تو بنا بھی نہ سکوں

میری آنکھوں، مِرے دل، میرے ہر اک شعر میں ہے
ایک مُورت کہ دکھاؤں تو دکھا بھی نہ سکوں

۱۹۵۷ء

○

دل خدا کا رسول ہو جائے
حجِ اکبر قبول ہو جائے

آپ جس خار کو ذرا چھو لیں
مسکرا کر وہ پھول ہو جائے

کہکشاں راہ میں اگر آئے
تیرے قدموں کی دھول ہو جائے

وصل کی شب کٹے نہ نیند آئے
یہ عبادت قبول ہو جائے

زندگی رائیگاں نہ جائے اگر
تیری زلفوں کا پھول ہو جائے

مسکرا دیں ترے خیال کے ساتھ
جب طبیعت ملول ہو جائے

بے طلب ہی پکار لیں ہم کو
کاش اُن سے یہ بھول ہو جائے

پیار کرنا کسی کا ہو رہنا
زندگی کا اصول ہو جائے

دم اگر تیرے روبرو نکلے
جاں کی قیمت وصول ہو جائے

۱۹۵۷ء

———

○

کوئی نہیں ہے بجز غم رفیقِ تنہائی
وہ غم کہ جس نے عطا کی مجھے شکیبائی

کوئی نہ چھین سکا قلب و جاں کی بینائی
کہاں کہاں کی ریاضت ہمارے کام آئی!

کسی کے پاس بھی رہ کر گریز ہے مجھ کو
میں خود کسی کی تمنّا ہوں یا تمنّائی؟

کہاں کہاں ہیں وہ یارانِ انجمن آرا!
صبا سے پوچھ تو لو کس دیار سے آئی!!

کچھ اس طرح سے کہ آنسو چھلک چھلک آئے
بہت دنوں میں مجھے آج تیری یاد آئی

تری نظر نے جو چھیڑا تھا دلربا سرگم
اسی کے سات سُروں نے یہ آگ بھڑکائی

یہ رنگ و نور، یہ لہروں کا پیچ و خم، یہ خمار
تمام حسنِ مجسّم، تمام رعنائی

تمھارا پیار مرے خوں میں رچ گیا شاید
کہ اب ہیں میرے پجاری، تمھارے شیدائی

ہم اہلِ عشق ہیں دیکھو ہماری جلوت بھی
تمھیں پسند سہی اپنی خلوت آرائی

ہماری ذات الگ ہے ہماری بات جدا
بہت ہیں یوں تو جہاں میں تمھارے سودائی

جلا سکی نہ ہمیں، خود ہی جل گئی یارو
نظر کے سامنے سو بار برق لہرائی

۱۹۵۷ء

———

○

لوگ راتوں کو ضیا مانگتے ہیں
ہم تری زلفِ رسا مانگتے ہیں

اُن کے جینے کی ہوس تو دیکھو
میرے مرنے کی دُعا مانگتے ہیں

جو سمجھتے ہیں وفا کا مفہوم
وہ کہاں اس کا صلا مانگتے ہیں

تیرے ہاتھوں پہ سجے رنگِ حنا
بس یہی آبلہ پا مانگتے ہیں

ہنستی گاتی رہیں صبحیں شامیں
یہ دُعا صبح و مسا مانگتے ہیں

ق

چاند سورج کو بھی لگتا ہے گہن
کبھی تارے بھی ضیا مانگتے ہیں

خشک ہو جاتے ہیں دریا بھی کبھی
کبھی گلشن بھی صبا مانگتے ہیں

تن سے چھن جاتا ہے ریشم کا لباس
نازنیں بندِ قبا مانگتے ہیں

راکھ بن جاتی ہے سیندور کی آگ
پاؤں گلزارِ حنا مانگتے ہیں

موت سو رنگ میں آتی ہے جمیل
لوگ جینے کی ادا مانگتے ہیں

۱۹۵۶ء

○

ہم نہ تھے تم نہ تھے بہار نہ تھی
زندگی اتنی کامگار نہ تھی

وہ نہ تھی جزوِ زندگی اے دوست
جو گھڑی وقفِ انتظار نہ تھی

دل میں سو اضطراب تھے لیکن
بے کلی رُخ سے آشکار نہ تھی

دل کی پہنائیاں تھیں، اور یہ تھی
یاد پہلے تو بے قرار نہ تھی!

خود مہکتے تھے اپنی خوشبو سے
زندگی رہنِ زلفِ یار نہ تھی

وہ بھی تھا تیرے جسم کا سیماب
چاندنی چاند کا غبار نہ تھی

اس میں کھو کر جہاں ملا ہم کو
بے خودی تیری رہگزار نہ تھی

اب تو ہر انجمن ہماری ہے
جب کوئی بزم سازگار نہ تھی

درد اٹھتا تو تھا مگر کم کم
اس قدر فکرِ روزگار نہ تھی

ہار سمجھا گیا اسے تو کیا!
میرا ایثار میری ہار نہ تھی

کب نہ تھا زندگی سے پیار ہمیں!
کب جمیلؔ اپنی جاں نثار نہ تھی!!

۱۹۵۶ء

○

جستجو حسن و آبرو کی ہے
یہ صدا ہم نے کو بہ کو کی ہے

تُو زباں پر تو دل میں اور کوئی
یہ خطا تیرے رُوبرو کی ہے

اپنی ہی جستجو کے پردے میں
ہم نے کس کس کی آرزُو کی ہے!

دن کو بھی فکرِ روزگار بہت
رات بھر تجھ سے گفتگو کی ہے

اپنی رُسوائی کا تو خوف نہیں
بات یہ تیری آبرو کی ہے!

کیوں اُفق پر ہے خُون کی لالی!
کس نے دُنیا لہو لہو کی ہے!!

پیرہن جل کے راکھ ہو بھی چکے
کس کو حاجت یہاں رفو کی ہے!

کتنا آباد ہے یہ ویرانہ!
کچھ خبر شہرِ آرزو کی ہے!

وسعتِ دو جہاں میں بکھری ہوئی
داستاں کس کے رنگ و بُو کی ہے؟

موت اب کیوں نہ خودکشی کر لے
ہم نے جینے کی آرزو کی ہے

۱۹۵۷ء

○

نظر جھکا کے اگر وہ ہمیں پسند کریں
تو تمکنت سے نہ کیوں اپنا سر بلند کریں!

نگاہ و دل میں سمٹ آئے شوقِ خود بینی
تو خود کو دیکھیں کہ ان کی نظر پسند کریں!

ادائے ناز سے جھک جائے سر اگر تیرا
تو پھر کہاں کا ارادہ نیاز مند کریں!

ہم اپنے ذوقِ تماشا کو آزما لیں گے
انھیں ہے زعم تو جلوے ہزار چند کریں

بہت ہے اپنے لیئے کاروبارِ میخانہ
حضور! ہم پہ درِ خانقاہ بند کریں

سرو چراغاں

تمام عمر جتن میں ترے غم کو اپنا کر
تری رضا ہو تو کیا کیا نہ درد مند کریں!

اگر یہی ہے خموشی تو آؤ سب مل کر
فضا میں نعرۂ دانشوراں بلند کریں

۱۹۵۷ء

نہ یُوں ملو کہ کوئی تم سا دُوسرا نہ ملے
نہ اس قدر مجھے چاہو کہ پھر خدا نہ ملے

وفا کرو مگر اتنی کہ تشنگی بھی رہے
وُہ عشق کیا کہ ہمیں لذّتِ جفا نہ ملے!

سنبھال کر مجھے رکھو حریمِ شوق میں تم
مگر نہ یُوں کہ کسی اور دل میں جا نہ ملے

نہ یُوں بڑھاؤ رہ و رسمِ عاشقی ہم سے
کہ پھر کسی کو محبّت کی انتہا نہ ملے

عجیب چیز ہے افسانۂ محبّت بھی
جو انتہا کو سمجھ لیں تو ابتدا نہ ملے

نگاہِ حُسن کی رمزیں اُسے کہاں معلوم!
جسے جہاں میں کوئی تم سا آشنا نہ ملے

ندائے عشق نہ کیوں گنبدِ دل پہ چھا جائے!
ادائے حُسن اگر جرأتِ آزما نہ ملے!!

کوئی خُوشی کے بھروسے پہ کیا جئے آخر!
اگر کسی کو ترا دردِ لا دوا نہ ملا!

جب آئے یاد، تو سو رنگ میں نظر آئے
وُہ خوش جمال کبھی ہم کو ایک سا نہ ملے

چلیں تو منزلِ وال آس پاس مل جائے
جو راہ پُوچھیں تو کوئی بھی رہنما نہ ملے

نہاک بہار کی، کیونکر چمن چمن پھیلے!
اگر جمیل گُلوں کو رمِ صبا نہ ملے!!

۱۹۵۷ء

○

وہ اگر پاسِ دوستی کرتے
جاں بھی ہم نذرِ عاشقی کرتے

تجھ کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہے
اور کیا تیرے اجنبی کرتے!

اے غمِ دوست! ہم کہاں ہوتے!
دل جو کہتا اگر وہی کرتے!

دل پتنگا نہ تھا کہ جل جاتا
اور کچھ تیز روشنی کرتے

ہم بھی رکھتے ہیں تیشۂ فرہاد
شرم آتی ہے خودکشی کرتے

سرورِ چراغاں

ابنِ مریم سے کم نہ تھے ورنہ
کس بھروسے پہ زندگی کرتے!

کوئی ہم سا ہمیں ملا ہی نہیں
کوئی ملتا، تو یاد بھی کرتے

وہ خدا ہی بنے رہے ورنہ
عمر بھر اُن کی بندگی کرتے

خود کو چاہا ہے اس طرح ہم نے
عمر گزری ہے عاشقی کرتے

سنہ ۱۹۵۷ء

○

کبھی حیات کا غم ناگوار ہی نہ ہوا
میں شکوہ سنجِ غمِ روزگار ہی نہ ہوا

گناہ ہم سے ہوئے تھے بہ حالِ مجبوری
خدا کے سامنے دل شرمسار ہی نہ ہوا

کرم کی آس پہ بیٹھے تھے جان دے بیٹھے
ستم کشوں سے ترا انتظار ہی نہ ہوا

چھپی تھی ہر بُنِ مُو میں وصالِ یار کی باس
فراقِ یار طبیعت پہ بار ہی نہ ہوا

جمیلؔ ہائے کسی کا وہ جذبۂ خاموش
جو دل ہی دل میں رہا آشکار ہی نہ ہوا

۱۹۵۴ء

○

کس کی محفل سے اُٹھ کے آیا ہُوں!
اپنے گھر میں ہُوں اَور تنہا ہُوں!!

تو مری زندگی کی شام نہ بن
مَیں، تری صُبح کا اُجالا ہُوں

چاند میں بستیاں بسا لینا،
مُجھ کو ڈھونڈو، کہ مَیں بھی دنیا ہُوں

جانِ امروز، رونقِ فردا
کوئی سمجھے مجھے تو کیا کیا ہُوں!

کیسے جُھٹلائے گی مُجھے دُنیا!
مَیں، کہ حالات کا تقاضا ہُوں!!

میری خوشبو سے بس رہے ہیں چمن
میں ہر اِک شاخِ گل سے پیدا ہوں

یہ جہاں مزرعِ تمنّا ہے
اور میں، حاصلِ تمنّا ہوں

۱۹۵۶ء